اردو (لازمی)

بارھویں جماعت کے لیے

Free From Government
NOT FOR SALE

خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور

محمود ثاقب

اُردو (لازمی)

بارھویں جماعت کے لیے

انگلش	Paks	اکنامکس HP	اردو	Swics
=	=	=	نمبرات	=
29			34	

خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور

جملہ حقوق بحق لیڈنگ پبلشرز محفوظ ہیں

منظور کردہ : وِفاقی وزارتِ تعلیم (شعبۂ نصاب) حکومتِ پاکستان، اسلام آباد

بمطابق: قومی نصاب 2006ء

مراسلہ نمبر F.1-22/2010-Urdu مؤرخہ 04-04-2011

مؤلف : پروفیسر محمد جمال

سرپرستی: سید بشیر حسین شاہ ناظم، نظامت نصاب وتعلیمِ اساتذہ خیبر پختونخوا، ایبٹ آباد

نظرِ ثانی وترامیم: سیدہ طاہرہ جبین، ایس ایس۔ ڈی سی ٹی ای، ایبٹ آباد
سائرہ بی بی، ایس ایس، گورنمنٹ گرلز ہائی سیکنڈری سکول حاجیہ گلی ایبٹ آباد
مشتاق احمد، پروفیسر، گورنمنٹ کالج خان پور (ہری پور)
اعجاز خان، اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج منڈیاں ایبٹ آباد
احمد رشید، ایس ایس۔ ٹیکسٹ بک بورڈ خیبر پختونخوا پشاور

مدیر : سلیم اللہ علوی، ماہرِ مضمون (اُردو) خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور

زیرِ نگرانی ورہنمائی : عصمت اللہ خان گنڈاپور، چیئرمین
سعید الرحمٰن، ممبر (ای اینڈ پی)
خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور

تعلیمی سال 21-2020ء
ویب سائٹ : www.kptbb.gov.pk
ای میل : membertbb@yahoo.com
فون نمبر: 091-9217159-60

حاصلاتِ تعلّم

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ:

* اُردو میں منثور اور منظوم کلام کی حُسن و قبح کے ساتھ پہچان کرسکیں۔
* عبارت کو استحسانی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے پڑھ سکیں اور ادبی محاسن (علمِ بیان، علم بدیع) کے حوالے سے عام اور ادبی تحریر میں فرق کرسکیں۔
* روز مرّہ مشاہدات وتجربات کو قواعد کے مطابق درست طور پر تحریر کرسکیں۔
* دفتری احکامات، قانونی فیصلے، وکالت نامہ اور دیگر سرکاری اور قانونی اصطلاحات کو سمجھ کر پڑھ سکیں۔
* ادب پارے کا مرکزی خیال ،بنیادی نِکات اور دیگر تشریحات تنقیدی اُصولوں کے تحت کر سکیں اور اقوال و اشعار کا حوالہ دے سکیں۔
* اخبارات و رسائل کے کسی بھی متن پر جامع تبصرہ لکھ سکیں۔
* کسی عبارت کو پڑھ کر اُس پر رائے دے سکیں اور عبارت میں موجود اغلاط کی نشاندہی کرتے ہوئے درست کرسکیں۔
* کسی بھی ادبی یا علمی موضوع پر درست تلفظ کے ساتھ کم ازکم دس منٹ تک لکھی ہوئی تقریر پڑھ سکیں۔
* کسی بھی علمی یا ادبی موضوع پر استدلال، مثالوں، مقولوں، مترادفات، اشعار و محاورات اور روزمرّہ کے مطابق کم از کم پانچ سو الفاظ کا مضمون لکھ سکیں۔
* شعری ونثری اصطلاحات مثلاً علمِ بیان ، معاون افعال،صنائع بدائع کی پہچان اور مرکّب جملوں کا درست استعمال کرسکیں۔
* مختلف علوم اور پیشوں کی اصطلاحی لغات اور عام لغات کا استعمال سیکھ سکیں۔

NOT FOR SALE

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

فہرست

حصّہ نثر

شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
۱۔	مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم	شبلی نعمانی	۱
۲۔	سُقراط	مہدی افادی	۱۰
۳۔	فاقہ میں روزہ	خواجہ حسن نظامی	۱۶
۴۔	پھر وطنیت کی طرف	مولانا صلاح الدین احمد	۲۶
۵۔	شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار	محمد حسین آزاد	۳۳
۶۔	چند روز ایک روڈ رولر کے ساتھ	ڈاکٹر وزیر آغا	۴۷
۷۔	منظور	سعادت حسن منٹو	۵۴
۸۔	کتبہ	غلام عباس	۶۶
۹۔	مائیں	احمد ندیم قاسمی	۷۸
۱۰۔	سیاہ فام	شوکت صدیقی	۸۷
۱۱۔	محسن محلّہ	اشفاق احمد	۹۸
۱۲۔	کنڈکٹر	الطاف فاطمہ	۱۰۶
۱۳۔	ایک وصیّت کی تعمیل	فرحت اللہ بیگ	۱۱۹
۱۴۔	علّامہ اقبالؒ	چراغ حسن حسرتؔ	۱۳۳
۱۵۔	طائرِ لاہُوتی	فارغ بخاری	۱۴۵
۱۶۔	مرید پور کا پیر	پطرس بخاری	۱۵۴
۱۷۔	حاجی اورنگ زیب خان	مشتاق احمد یوسفی	۱۶۸

حصۂ نظم

شمار	عنوان	شاعر	صفحہ
۱۔	جوابِ شکوہ	علامہ اقبالؔ	۱۸۷
۲۔	بڑھے چلو	اخترؔ شیرانی	۱۹۴
۳۔	مناظرِ سَحر	جوشؔ ملیح آبادی	۱۹۸
۴۔	شکست کی آواز	میرا جی	۲۰۳
۵۔	ستارے	ن۔م۔ راشدؔ	۲۰۷
۶۔	نفیرِ عمل	مجید امجدؔ	۲۱۱
۷۔	ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں	منیرؔ نیازی	۲۱۵
۸۔	بڑے ڈرپوک ہو	وزیرؔ آغا	۲۱۸

حصۂ غزل

شمار	عنوان	شاعر	صفحہ
۹۔	جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں	علامہ اقبالؔ	۲۲۲
۱۰۔	کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں	فیض احمد فیضؔ	۲۲۵
۱۱۔	کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مرجاؤں گا	احمد ندیمؔ قاسمی	۲۲۸
۱۲۔	سفر منزلِ شب یاد نہیں	ناصرؔ کاظمی	۲۳۰
۱۳۔	آکے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے	شکیبؔ جلالی	۲۳۲
۱۴۔	لب کشا لوگ ہیں ، سرکار کو کیا بولنا ہے	احمد فرازؔ	۲۳۵
۱۵۔	مل کے بیٹھے نہیں، خوابوں میں شراکت نہیں کی	ظفرؔ اقبال	۲۳۸
۱۶۔	نہ سہی کچھ مگر اتنا تو کیا کرتے تھے	شہزادؔ احمد	۲۴۲

فرہنگ ۲۴۶

مولانا شبلی نعمانی

ولادت: ۱۸۵۷ء | وفات: ۱۹۱۴ء

مولانا شبلی نعمانی اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندول میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا۔ ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ سے حاصل کرنے کے بعد عربی و فارسی ادب کی تحصیل کے لیے غازی پور جا کر مولوی محمد فاروق کے شاگرد ہو گئے۔ انھوں نے حصولِ تعلیم کے لیے دُور دراز کے سفر کیے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد اُنھوں نے وکالت شروع کی اور کچھ عرصہ امین دیوانی کی حیثیت سے کام کیا، لیکن جلد ہی طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ سرسید سے ملاقات کے بعد وہ علی گڑھ کالج میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ شبلی نعمانی نے مختلف ممالک کے سفر بھی کیے۔ علی گڑھ کالج سے علاحدگی کے بعد اُنھوں نے دارالمصنّفین کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ اسلام اور اسلامیات کے لیے ممتاز تھا۔

شبلی نعمانی ایک نابغۂ روزگار ہستی تھے۔ وہ بیک وقت شاعر، مؤرّخ، سوانح نگار، انشا پرداز، مفکّر اور مصلح تھے۔ وہ سرسید کے دبستان سے وابستہ تھے لیکن اُن کا اسلوب اور طرزِ بیان منفرد ہے۔ وہ اپنی تحریر میں تشبیہات اور استعارات کا بخوبی استعمال کرتے ہیں۔ اُن کی عبارت مختصر اور پُر جوش ہے۔ تحریر میں روانی اور دلکشی ہے۔ وہ اپنی بات کو منطقی استدلال اور عقلی دلائل سے ثابت کرتے ہیں۔ اُن کو اُردو کا پہلا مؤرّخ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اُن کی تاریخ نگاری کی بنیاد تحقیق اور سند پر ہے۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ "سیرت النبی ﷺ" ہے۔ اگرچہ وہ اس تصنیف کو اپنی زندگی میں مکمل نہ کر سکے اور اُن کی وفات کے بعد اُن کے ہونہار شاگرد سید سلیمان ندوی نے اس کی تکمیل کی۔

تصانیف: سیرۃ النبی ﷺ ، الفاروقؓ، المامون، الغزالی، سیرت النعمانؒ، شعر العجم وغیرہ

NOT FOR SALE

مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم

۱۴۵ھ تک یعنی جب تک تصنیف وتالیف شروع نہیں ہوئی تھی جو تعلیم وتعلّم تھی، وہ عرب کے سادہ اور نیچرل طرزِ زندگی کے لیے موزوں تھی۔ علوم وہ تھے، جن کو حافظہ سے زیادہ تر تعلق تھا۔ بحث طلب مسائل بھی معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہ تھے اور طرزِ تعلیم تو بالکل وہی تھا، (یعنی سند و روایت) جو قدیم زمانے سے ان میں رائج تھا، لیکن سو برس کی مدت میں تمدن بہت کچھ ترقی کر گیا اور اسی نسبت سے تعلیم بھی زیادہ وسیع اور مرتب و باقاعدہ ہو چلی۔ اس دور میں جن علوم کو رواجِ عام حاصل ہوا وہ نحو، معانی، لغت، فقہ، اصول، حدیث، تاریخ، اسماء الرجال، طبقات اور ان کے متعلقات تھے۔ عقلی علوم کا سرمایہ گو بہت کچھ جمع ہوگیا تھا مگر رواجِ عام نہ حاصل کر سکا، جس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت نے اس کی اشاعت پر چنداں زور نہیں دیا اور عام ملک کو کچھ ناواقفیت، کچھ مذہبی غلط فہمی کی وجہ سے فلسفہ ومنطق کے ساتھ ہمدردی نہ تھی۔

تعلیم کا یہ دوسرا دور عجیب دلچسپیوں سے بھرا ہے۔ دیکھو دریائے سندھ کے کنارے تک اسلام حکومت کر رہا ہے۔ سیکڑوں قبیلے ریگستانِ عرب سے نکل کر دور دراز ملکوں میں آباد ہوتے جاتے ہیں۔ بہت سی قومیں، دلی ذوق سے اسلام کے حلقے میں داخل ہو رہی ہیں لیکن اب تک اس وسیع دنیا میں سلطنت کی طرف سے نہ کوئی سررشتۂ تعلیم ہے نہ یونیورسٹیاں ہیں، نہ مدرسے ہیں۔ عرب کی نسلیں حکمران ہیں مگر حکومت ایسی بے تعلق اور اوپری ہے کہ ملک کے عام اخلاق، معاشرت، تمدن پر فاتح قوم کی تہذیب کا اثر چنداں نہیں پڑسکتا۔ تمام علوم پر عربی زبان کی مہر لگی ہے۔ ان سب باتوں پر دیکھو کہ علوم وفنون کس تیزی اور وسعت سے بڑھتے جاتے ہیں۔ مرو، ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام، اندلس کا ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک گاؤں علمی صداؤں سے گونج اٹھا ہے۔ عام تعلیم کے لیے ہزاروں مکتب قائم ہیں جن میں سلطنت کا کچھ

بھی حصہ نہیں ہے اور جو آج کل کے تحصیلی مدارس سے زیادہ مفید اور فیاض ہیں۔ اوسط اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے، علما کے ذاتی مکانات ہیں لیکن ان سادہ اور بے تکلف عمارتوں میں جس وسعت اور فیاضی کے ساتھ علم کی تربیت ہو رہی ہے بڑے بڑے عالی شان قصر و ایوان میں بھی جو پانچویں صدی کے آغاز میں اس غرض سے تعمیر ہوئے، اس سے کچھ زیادہ نہ ہوسکی۔ اگرچہ اِس وقت اُس زمانے کا کوئی رجسٹر موجود نہیں، جس سے ہم حساب لگاسکیں کہ فیصدی کتنے آدمی تعلیم یافتہ تھے لیکن تذکرے، تراجم، اسماء الرجال، طبقات کی سیکڑوں، ہزاروں کتابیں موجود ہیں جن سے ہم صحیح اندازے کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔ اگرچہ متواتر انقلابات، تخت گاہوں کی بربادی، سپین کی تباہی، تاتار کی عام غارت گری کے بعد ہمارے پاس جو کچھ رہ گیا ہے وہ ہزار میں ایک بھی نہیں ہے اور اس وجہ سے ہزاروں لاکھوں ناموروں کی صورتیں زمانے کی تاریخی نگاہ سے چھپ گئی ہیں، تاہم ہر عہد میں ہم سیکڑوں ماہرین و مجتہدینِ فن کا نشان دے سکتے ہیں۔ صرف ہم عصر و ہم وطن اہلِ کمال کی فہرست تیار کی جائے تو بھی بہت سی جلدیں تیار ہوسکتی ہیں۔ ڈاکٹر سپرنگر[1] صاحب تخمینہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے اسماء الرجال میں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا حال مل سکتا ہے۔ اب اگر یہ قیاس لگایا جائے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں کس نسبت سے ایک صاحبِ کمال پیدا ہوتا ہے تو عام تعلیم کا ایک معقول اندازہ ہوسکتا ہے۔

مشہور علما کے تعلیمی حالات پڑھو۔ ایک ایک اُستاد کے حلقۂ درس میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں طالب علم مشغولِ درس نظر آئیں گے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ اس زمانے کے بعض حلقۂ درس ایسے ہوتے تھے جن میں دس ہزار سے زائد دواتیں رکھی جاتی تھیں اور لوگ احادیثِ نبویؐ لکھتے تھے۔ اس بڑے مجمع میں دو سو امام حاضر ہوتے تھے، جو اجتہاد اور فتویٰ دینے کی پوری قابلیت رکھتے تھے۔

اُس دور میں تعلیم کا مستند طریقہ وہی تھا جو آج مہذب ملکوں میں جاری ہے، یعنی املا، جس کو اُردو میں لیکچر دینا کہتے ہیں۔ اُستاد ایک بلند مقام مثلاً کرسی یا منبر پر بیٹھ جاتا تھا اور کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا

[1] Sprenger -

شروع کرتا تھا۔ طالب علم جو ہمیشہ قلم دوات لے کر بیٹھتے تھے ان تحقیقات کو استاد کے خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے اور اس طرح ہر ایک کی مستقل کتاب تیار ہوجاتی تھی اور امالی کے نام سے مشہور ہوتی تھی۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے دور دراز مسافتوں کا طے کرنا اور متعدد اہل کمال کی خدمت میں پہنچ کر فائدہ اٹھانا نہایت ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ مشہور اہلِ فن کی لائف چھان ڈالو۔ اس زمانے میں ایک مشہور فاضل جو سفر کی زحمت اُٹھائے بغیر اپنے فن میں نامور ہوا اس زمانے کے لوگ ہمیشہ اس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بغداد، نیشاپور، قرطبہ وغیرہ میں گو ہر فن کے کامل شناسا موجود تھے مگر ان شہروں کے رہنے والے بھی مشرق مغرب کی خاک چھانے بغیر نہیں رہتے تھے۔ علامہ مُقرّی کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ انھی علما کے حالات میں ہے جو سپین سے مصر وشام وبغداد گئے یا ان مقامات سے چل کر سپین میں داخل ہوئے۔ جس کثرت اور جوش وسرگرمی سے تعلیم کے لیے ہمیشہ مسلمان سفر کرتے رہے ہیں دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر موجود نہیں ہے۔

دوسری چیز جو اعلیٰ تعلیم کے لیے گویا لازمی تھی، مناظرہ کی مجلسوں میں شریک ہونا تھا۔ مشہور شہروں میں بحث و مناظرے کے لیے خاص وقت اور مقام مقرر تھے۔ بعض امرا اس قسم کی مجلسیں اپنے مکانوں میں منعقد کرتے تھے۔ فقہ، ادب، نحو وغیرہ ہر علم کے لیے جداگانہ مجلسیں تھیں۔ ان میں علما اور طلبہ دونوں شریک ہوتے تھے اور کوئی ممتاز عالم بحث کے تصفیے کے لیے انتخاب کیا جاتا تھا۔ یہ جلسے، جن میں زیادہ تر حق پسندی اور انصاف کا استعمال ہوتا تھا، معمولی نصابِ تعلیم ختم کرنے کی نسبت بہت زیادہ مفید تھے۔ تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد اُستاد ایک تحریری سند عطا کرتا تھا، جس میں اس کی تعلیم کی ایک اجمالی کیفیت اور درس دینے کی اجازت لکھی ہوتی تھی۔ اس سند میں وہ طیلسان پہننے کی بھی اجازت دیتا تھا جو علما کا مخصوص لباس تھا۔ تعلیم کی وسعت کے متعدد اسباب تھے:

(۱) دینی تعلیم مذہب کا ایک ضروری جز بن گئی تھی۔ قرآن وحدیث (جن پر مذہب کی بنیاد تھی) عربی زبان کے ساتھ خصوصیت رکھتے تھے۔ اتنے تعلق سے نحو، صَرف، لغت، معانی، اسماء الرجال بھی گویا مذہبی تعلیم کے ضروری اجزا تھے۔ فلسفے نے علمِ کلام کی صورت میں مذہبی علم ہونے کی عزت حاصل

NOT FOR SALE

کی تھی۔ اب خیال کرو کہ ایک قوم، جس میں اسلام کا جوش ابھی تازہ ہے، جس کی رگوں میں ہنوز عرب کا لہو ہے، جس کی ہمتیں بلند، ارادے مستقل، حوصلے وسیع ہیں اور پیہم ملکی کامیابیوں نے اُس کے جوش کو زیادہ تیز کردیا ہے، جب کسی کام پر پوری توجہ سے مائل ہوگی، تو اسے کس حد تک پہنچا کر رہے گی۔ عرب کے سوا دوسری قومیں جو اسلام قبول کرچکی تھیں، مذہب نے ان کو بھی انھیں سرگرم جذبات سے بھر دیا تھا، جو عرب کے ذاتی خاصے تھے۔ یہی بات ہے کہ نحو، لغت، حدیث، اصول فقہ، فلسفہ کے امام و پیشوا قریباً کل عجمی ہیں۔

(۲) تعلیم، مسجدوں اور علما کی خاص درسگاہوں میں مقیّد نہ تھی۔ وزرا، حکام، فوجی افسر، اہلِ منصب ہر طبقے کے لوگ پڑھتے پڑھاتے رہتے تھے۔ وزارت کے کثیر الاشغال وقت میں بھی بوعلی سینا کی خدمت میں مستعد طلبہ کا ایک گروہ حاضر رہتا تھا۔

(۳) تعلیم میں نہایت آزادی تھی۔ کسی مقررہ نصاب کی پابندی ضروری نہیں تھی۔ جو شخص، جس خاص فن کو چاہتا تھا، حاصل کرسکتا تھا۔ اہلِ کمال کے زمرے میں سیکڑوں گزرے ہیں، جو ایک فن میں امام تھے اور دوسرے فنون میں معمولی طالب علم کا بھی درجہ نہیں رکھتے تھے۔

(۴) امرا اور اہلِ منصب کا گروہ جو شائقینِ علم کی سرپرستی کرتا تھا، عموماً تعلیم یافتہ اور پایہ شناس تھا۔ تعلیم کی اشاعت کا یہ بہت بڑا سبب تھا۔ سلاطین و وزراء تو ایک طرف، معمولی سے معمولی رئیس کی خدمت میں سیکڑوں ادیب وفاضل موجود ہوتے تھے اور چونکہ اُن کی تنخواہیں کسی خدمت کے صلے میں نہیں بلکہ صرف ان کا ذاتی کمال اور قبول عام مہنگے داموں خریدا جاتا تھا۔ تمام ملک میں لیاقت اور شہرت پیدا کرنے کا عام جوش پھیل گیا تھا۔ تصنیفات میں زورِ طبع کے ساتھ تحقیق واحتیاط کا لحاظ اس لیے زیادہ تر کرنا پڑتا تھا کہ جن قدر دانوں کے سامنے پیش کرنا ہے وہ خود صاحب النظر اور نکتہ چیں ہیں۔

مدرسوں کے قائم ہونے نے دفعتاً کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ نصابِ تعلیم قریباً وہی رہا جو پہلے تھا۔

NOT FOR SALE

پرائیویٹ تعلیم گاہیں عموماً قائم رہیں اور حق یہ ہے کہ جب تک ان پر کچھ زوال نہیں آیا تعلیم بھی نہایت وسعت سے جاری رہی لیکن رفتہ رفتہ ان مدرسوں میں خاص خاص قاعدوں کی پابندیاں شروع ہوئیں اور سلطنت عثمانیہ کے زمانے میں تو گویا تعلیم کا ایک جداگانہ قانون پاس کیا گیا۔ آٹھویں صدی سے پہلے فارغ التحصیل ہونے کے لیے ایک خاص مدت معین ہوچکی تھی، گو ملکوں کے اعتبار سے مختلف تھی۔ مثلاً مغرب (مراکو) وغیرہ میں سولہ برس اور تیونس میں پانچ برس طالب علم کو تعلیم گاہ میں رہنا لازمی تھا۔ املا کا طریقہ بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا۔ تیسرے دور میں اس بات نے تعلیم کو نہایت ابتر کردیا کہ جو فن مقصود بالذات نہ تھے مثلاً نحو، صرف، منطق وامثال ذالک ان کی تعلیم میں وہ اہتمام اور موشگافیاں ہونے لگیں کہ عمر کا ایک بڑا حصہ انھیں کی نذر ہوگیا اور اتنا وقت نہ مل سکا کہ جن علوم کی تکمیل مقصود اصلی تھی ان پر پوری توجہ ہوسکتی۔ تصانیف کی کثرت اور ان کا درس میں داخل ہونا، اس بات نے بھی نہایت ضرر پہنچایا۔ پہلے اور دوسرے دور میں زیادہ تر فن کی تعلیم ہوتی تھی، لیکن تیسرے دور نے کتابی تعلیم کی بنیاد ڈالی، جس میں اصلی مسائل سے زیادہ کتاب کی عبارت اور ان کے متعلقات سے بحث ہوتی تھی۔ ان مدرسوں میں فلسفہ و منطق کی تعلیم کا بہت کم اہتمام تھا اور اکثر نامور مدرسوں میں ان علوم نے رسائی ہی نہیں پائی۔

انقلاباتِ حکومت جو کثرت سے ممالکِ اسلامی میں ہوا کیے۔ ان مقاصد کے لیے اکثر مفید ثابت ہوئے۔ ایک خاندان کلیتاً برباد ہوجاتا تھا مگر اس کے علمی آثار اکثر محفوظ رہتے تھے۔ جو مواضع اور علاقے مدرسوں پر پہلے وقف ہوچکے تھے، دوسری نئی حکومت ان کو غصب نہیں کرسکتی تھی۔ ہلاکو خاں نے نہ صرف بغداد کو غارت کیا بلکہ تمام ممالکِ اسلامی کو برسوں تک بے چراغ کر دیا۔ تاہم اوقاف میں کچھ تصرف نہ کرسکا۔ اس نے بغداد وغیرہ کے تمام اوقاف، محقق طوسی کے ہاتھ میں دیے جس کا بہت بڑا حصہ محقق موصوف نے رصد خانے کی تعمیر میں صرف کیا۔ ممالکِ اسلامی میں جب کوئی نئی حکومت قائم ہوتی تھی، تو اس کو استحکامِ سلطنت اور عظمت و جلال قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ مدرسوں کی تعمیر اور علم کی اشاعت میں پچھلی حکومتوں سے زیادہ فیاضیاں دکھائے۔

ہم نے اس آرٹیکل میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مدرسوں کے حالات لکھے ہیں مگر ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ اسلامی تعلیم کا اندازہ کرنے کا یہ نہایت چھوٹا پیمانہ ہے۔ ہماری علمی فیاضیوں اور ایجادات و صنائع کو مدرسوں کے احاطے سے باہر ڈھونڈ نا چاہیے۔ مدرسوں کی کثرت اور عالمگیر رواج نے بھی پرائیوٹ تعلیم گاہوں کی تعداد کو کم نہیں کیا۔ ۷۴۸ھ میں جب کہ مصر مدرسوں اور دارالعلوم سے معمور تھا، خود مصر کی ایک جامع مسجد میں چالیس سے زائد حلقۂ درس تھے، جن میں ہر قسم کے علوم وفنون پڑھائے جاتے تھے۔

میں نے اس آرٹیکل میں اس بات سے قصداً پرہیز کیا ہے کہ سلف کے کارنامے زیادہ آب و تاب سے لکھوں۔ قوم کی آج یہ حالت ہے کہ جتنا لکھا گیا ہے یہ بھی اس کے چہرے پر نہیں کھلتا۔ سلف کے مفاخر کا ہم کیا ذکر کرسکتے ہیں۔ ہم نے جب خود کچھ نہیں کیا، تو اس سے کیا حاصل کہ سلف نے بہت کچھ کیا تھا۔

(مقالاتِ شبلی)

مشق

۱۔ سوالات کے جوابات لکھیں۔

(الف) ۱۴۵ھ سے پہلے مسلمانوں کا طرزِ تعلیم کیسا تھا؟

(ب) مسلمانوں کے طرزِ تعلیم کے دوسرے دور پر روشنی ڈالیں۔

(ج) مسلمانوں کے تیسرے دورِ تعلیم میں کیا خرابیاں پیدا ہوئیں؟

(د) مسلمانوں کی تعلیم وتدریس کے مراکز کون کون سے تھے؟

(ہ) تعلیم کے لیے جُداگانہ قانون کس زمانے میں بنایا گیا؟

۲۔ خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) علوم وہ تھے جن کو ________ سے زیادہ تر تعلق تھا۔

(ب) مذہبی ________ کی وجہ سے فلسفہ اور منطق سے ہمدردی نہ تھی

(ج) دریائے سندھ کے کنارے تک ________ حکومت کر رہا تھا۔

(د) مناظرہ کی مجلسوں میں شرکت ________ کے لیے ضروری تھا۔

(ہ) تیسرے دور نے ________ تعلیم کی بنیاد ڈالی۔

۳۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگائیں اور معنی لکھیں۔

معمور، دفعتاً، عجمی، غارت گری، مجتہدین،

۴۔ موجودہ تعلیمی اور امتحانی نظام کے حُسن و قبح پر ایک مفصّل مضمون لکھیں۔

رُموزِ اوقاف:

رَمز ایما و اشارہ کو کہتے ہیں، رُموز اس کی جمع ہے جب کہ وقف کے معنی الگ کی ہوئی چیز کے ہیں۔ ”گرامر / قواعد کی اصطلاح میں اُن علامتوں کو ”رموزِ اوقاف“ کہتے ہیں جو دو لفظوں، دو فقروں یا جملوں کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ کریں“۔ تحریر میں وقفہ یا ٹھہراؤ کے لیے مخصوص علامات لگائی جاتی ہیں تاکہ مطلب واضح ہو سکے اور تحریر میں اُلجھاؤ پیدا نہ ہو، اِن علامات کے استعمال سے قاری کو عبارت سمجھنے اور پڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ تحریر میں یہ علامتیں موجود نہ ہوں تو پوری عبارت صرف مسلسل الفاظ کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔

اِن علامات کو مختلف مشقوں میں مع تعریف شامل کیا گیا ہے۔

رابطہ: (:)

- اس کا استعمال وہاں ہوتا ہے جہاں جملے کی کسی سابق بات یا خیال کی تشریح یا تصدیق کی ضرورت ہو۔

بقول شاعر: ع آدمی کو صاحبِ کردار ہونا چاہیے

- کسی مختصر مقولے یا کہاوت کو بیان کرنا ہو یا تمہیدی جملے کے بعد یہ علامت آتی ہے۔

سالک صاحب نے کیا خوب کہا ہے: تندرستی ہزار نعمت ہے۔

- دو ایسے جملوں کے درمیان جو ایک دوسرے کی ضد ہوں لیکن دونوں مل کر جملہ پورا کریں۔ مثلاً:-

انسان چل سکتا ہے: اُڑ نہیں سکتا

تفصیلیہ: (:-) یہ لفظ تفصیل سے نکلا ہے۔ جس کے معنی، تشریح کرنا یا فہرست کے ہیں۔ یہ علامت وہاں لگائی جاتی ہے جہاں مثال، فہرست یا کوئی تفصیل بیان کرنی ہو مثلاً:-

- لائبریری کے لیے خریدی گئی کتابوں کی تفصیل یہ ہے:-

دیوانِ غالب، کلیاتِ اقبال، نسخہ ہائے وفا۔ آبِ گُم

- کسی عبارت میں مثال پیش کی جائے۔ مثلاً:-

حروفِ اضافی سے ملنے والے مرکباتِ کو مرکباتِ اضافی کہتے ہیں۔

مثلاً:- خالد کا گھر، گاڑیوں کا ورکشاپ وغیرہ

- جب کسی عبارت میں تفصیل لکھنی ہو تو بھی تفصیلیہ لگاتے ہیں جیسے:-

ذرا میری روداد سنو:- میں ٹھیک نو بجے گھر سے نکلا، بس سٹاپ پر کھڑا ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۵۔ درج بالا علامات کو استعمال کرتے ہوئے ہر علامت کی دو دو مثالیں دیں۔

مہدی افادی

ولادت: ۱۸۷۵ء

وفات: ۱۹۲۱ء

مہدی افادی کا اصل نام مہدی حسن تھا۔ وہ گورکھپور کے ایک شریف اور معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی علی حسن تھا۔ مہدی افادی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ چنانچہ گھر پر ہی عربی، فارسی اور اُردو کی اچھی خاصی استعداد بہم پہنچائی۔ پھر ایک انگریزی سکول میں داخل ہوئے۔ کچھ مدت علی گڑھ میں بھی زیرِ تعلیم رہے۔ اُنھوں نے عملی زندگی کا آغاز نائب تحصیلداری سے کیا۔ مہدی افادی ایک نفیس انسان تھے، اُن کا ادبی ذوق بھی نہایت پاکیزہ تھا۔ اپنے زمانے کے عظیم اہلِ قلم اور ادیبوں سے ان کے ذاتی مراسم تھے جن میں سرسید، حالؔی، شبلؔی، سید سلیمان ندوی اور عبدالماجد دریابادی وغیرہ شامل ہیں۔ مہدی افادی کا انتقال ۴۶ برس کی عمر میں ہوا۔

مہدی افادی کے مضامین کا ایک مجموعہ ''افاداتِ مہدی'' کے نام سے اُن کی اہلیہ نے ان کی وفات کے بعد ترتیب دے کر شائع کیا۔ اُن کی تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت زندہ دلی اور ظرافت ہے۔ اُن کی تحریر شگفتہ اور رواں ہے۔ اُنھوں نے خشک اور سنجیدہ مضامین کو بھی اپنی طبعی شگفتگی سے دلچسپ اور جاذبِ نظر بنایا ہے۔ اُنھوں نے اپنے دلکش اسلوبِ بیان اور جمالیاتی نقطۂ نظر کی بدولت مقبولیت حاصل کی۔ اُردو ادب میں اُنھیں رومانی تحریک کے محرکین میں شمار کیا جاتا ہے۔

تصنیف:۔ افاداتِ مہدی۔

سُقراط

سقراط، یونان کے مشہور اور نامور حکما میں سے تھا، ایتھنس میں پیدا ہوا۔ یہ شہر کسی وقت میں یونان کا دارالسلطنت تھا۔ اس میں یونیورسٹی بھی تھی، سقراط کا باپ ایک بت تراش تھا۔ آبائی پیشہ کی رعایت سے اس وحیدِ عصر نے بھی سنگ تراشی میں مشق بہم پہنچائی مگر آخر اسے فلسفہ کی تحصیل کا شوق ہوا چونکہ طبیعت میں قدرتی طور پر اعلیٰ درجہ کی صلاحیت موجود تھی۔ اس نے نہایت تیزی کے ساتھ فلسفہ کا اثر قبول کیا۔ اوائل عمر میں باقتضائے آئینِ ملکی اسے فوج میں داخل ہونا پڑا۔ کئی لڑائیوں میں اس نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں کیے۔ ذنوفن اور ایلسی بائڈیز، سے لائق شخصوں کی جان اسی نے بچائی۔ اسی وجہ سے ان دونوں کو بھی اس کے ساتھ بہت محبت تھی۔ ذنوفن فوج کا ایک سردار ہونے کے سوا، صاحبِ تصنیف بھی تھا۔ اس کی تصنیفات خاص پایہ کی ہیں۔ ایلسی بائڈیز ایک امیر کا بیٹا تھا۔ ہر قسم کے اوصاف اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے، حسنِ صورت کے ساتھ اعلیٰ حسنِ سیرت سونے پر سہاگے کا رتبہ رکھتا تھا۔

لڑائی سے فراغت کے بعد سقراط نے اپنی پہلی وضع تبدیل کر دی۔ کھانے کپڑے میں سادگی برتی۔ فلسفیانہ تحریریں شائع کیں۔ ہم وطنوں کو پابندئ مذہب کی تاکید کی۔ رفتہ رفتہ حکیموں کی ایک کثیر جماعت اس کے خیالات سے فائدہ اٹھانے لگی۔ پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری ہوا۔ مختلف باغوں اور دریا کے کنارے پر یہ اپنے شاگردوں کو حکمت و فلسفہ کے نازک مسئلے سمجھایا کرتا۔ یہ طبیعت کا بہت آزاد تھا اور انتہا درجہ کا خوش تقریر بھی۔ اس کی فلسفیانہ نکتہ سنجیاں آخر میں اس کے ہم وطنوں کے لیے رشک و حسد کا باعث ہوئیں۔ ایک شاعر نے اس کی ہجو لکھی، جس کا منشا یہ تھا کہ سقراط نوجوانانِ ایتھنس کے اَخلاق کو خراب کرتا ہے اور لڑکوں کو سکھلاتا ہے کہ اپنے والدین کی اطاعت سے انحراف کریں۔ عدالت نے اسی بنا پر سقراط کو مجرم ٹھہرایا۔

تحقیقات کی گئیں۔ نتیجہ اس کو صرف گردن زدنی ثابت کرتا تھا۔ یہ حراست میں لے لیا گیا۔ اس کے احباب نے رہائی کی بہتیری صورتیں نکالیں۔ خود داروغۂ جیل اس کے بھاگ جانے پر راضی ہوا مگر سقراط کو جس وقت اس ارادے کی خبر دی گئی اس نے اختلاف کیا اور نہایت استقلال سے یہ بات کی کہ" میں موت سے بھاگنا نہیں چاہتا" جیل میں اسے زہر کا پیالہ دیا گیا۔ اس نے بے تکلف اپنے ہونٹوں سے لگایا اور اپنی جان دے دی۔

سقراط کے خونِ ناحق سے اہلِ ایتھنس کو بعد میں سخت پشیمانی ہوئی اور اس کے دشمنوں کو نہایت ذلّت کے ساتھ اپنی نالائقی کے خمیازے کھینچنے پڑے۔ سقراط کی سوانح عمری ذنوفن اور افلاطون نامی اس کے شاگردوں نے لکھی ہے۔ ان دونوں نے اس کے اقوال کی علیحدہ علیحدہ ترتیب دی ہے، جو واقعی دیکھنے کے لائق ہے۔

سقراط نے شادی بھی کی تھی۔ اس کی بیوی بہت ہی بدمزاج تھی۔ سقراط کے ساتھ اس کا برتاؤ سخت تھا لیکن وہ ہمیشہ اس سے نرمی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کی بدمزاجی سے فائدہ اٹھایا۔ اس کی کچی پکی سہہ لینے سے یہ انتہا درجہ کی برداشت کا خوگر ہوگیا۔ ۴۷۰ برس پیشتر حضرت عیسیٰ کے پیدا ہوا اور ۳۹۹ برس قبل وفات پائی۔

سقراط کی رائے میں موجودہ وقت کو کسی آنے والے دن کی امید پر رائیگاں کر دینا بڑی غلطی ہے۔ وہ کسی چیز کا پس انداز کرنا اسی لیے ایک سرے سے فضول سمجھتا ہے۔ اکتسابِ علم کے لیے اس کے خیال میں کسی وقتِ خاص کی قید نہیں۔ عمر کا ہر حصہ انسان کی معلومات کو ترقی دے سکتا ہے۔ اس کی رائے میں کتب بینی ہی ایک عیش ہے۔ جو ہر شخص کا اختیاری امر ہے۔ وہ ایک جاہل کو واجب الرحم سمجھتا ہے، مگر اس سے بھی زیادہ اس شخص کی ہمدردی کرتا ہے، جس کا مربی کوئی بدتہذیب اور تاریک خیال کا آدمی ہو۔ وہ کہتا ہے عالی ظرف کی پہچان یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی معزز برتاؤ ہو۔ زیادہ سے زیادہ کوششیں اس کی یہیں تک محدود ہوں کہ دشمن کو تکلیف دینے سے محفوظ رہ سکے۔ غیبت کرنے والوں یا ایسے لوگوں کو جن کو دوسروں کی برائی

میں دلچسپی ہوتی ہے، وہ شریف نہیں سمجھتا۔ ان کے ساتھ انتہائی رعایت یہ ہے کہ ان کو کمینہ کہا جائے۔ آخر میں وہ ہر شخص کو اپنی کانشنس کی پیروی کی تاکید کرتا ہے۔ اس نے زور دے کر یہ بات بتائی ہے کہ صرف اصلیت پر نظر ہونی چاہیے، اس سے غرض نہیں، دوسرے کیا سمجھتے ہیں۔ وہ عام مقبولیت کی خواہش کو ایک طرح سے جنون سمجھتا ہے۔

ایک مقام پر اس نے بہت چُبھتی ہوئی بات لکھی ہے، کہتا ہے کہ" میں نہیں سمجھتا کیونکر لوگ عقل کی مخالفت کو جائز رکھتے ہیں، کسی بات کی صحت پر ان کو یقینِ کامل ہوتا ہے، تاہم وہ اس پر کاربند نہیں ہوتے، شاید کوئی خارجی اثر وجۂ مزاحمت ہو، مگر میں سمجھتا ہوں، ان کے ارادہ ہی کا یہ نقص ہے، مجھے آج تک کوئی بات ایسی نہ ملی جس کی سچائی کا یقین ہو، اور نہ کر گزرا ہوں، لوگ کچھ ہی سمجھا کریں، مجھے ان کی مخالفت کی قطعی پروا نہیں، اس لیے میں ان کو داخلِ جمادات سمجھتا ہوں"۔

(افاداتِ مہدی)

مشق

۱۔ مختصر جواب تحریر کریں۔

(الف) سقراط کے مخالفین نے اُن پر کیا الزامات لگائے؟

(ب) سقراط کے لیے کیا سزا تجویز کی گئی؟

(ج) سقراط کو فوج میں کیوں بھرتی ہونا پڑا؟

(د) سقراط کے شاگردوں کے نام لکھیں۔

(ہ) سقراط کی تعلیمات کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

(و) سقراط نے کتنے برس کی عمر پائی؟

۲۔ خالی جگہ مناسب الفاظ سے پُر کریں۔

(الف) سقراط کا باپ ایک ______ تھا۔

(ب) سقراط کے نزدیک کسی چیز کا ______ کرنا ایک فضول کام ہے۔

(ج) داروغۂ جیل نے سقراط کو ______ جانے کی ترغیب دی۔

(د) سقراط کی طبیعت نے تیزی کے ساتھ ______ کا اثر قبول کیا۔

(ہ) سقراط ایک ______ شخص کو واجب الرحم سمجھتا تھا۔

۳۔ اس مضمون کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۴۔ درج ذیل الفاظ درست اعراب کے ساتھ لکھیں۔

جمادات، پیروی، رشک وحسد، استقلال، ذلت۔

۵۔ تحریکِ پاکستان کے کسی رہنما کی زندگی اور خدمات پر ایک مفصل مضمون لکھیں۔

رموزِ اوقاف:

واوین(" "): جب کوئی اقتباس دیا جائے یا کسی کا قول نقل کیا جائے تو اس کے آغاز اور اختتام پر یہ علامات لگائی جاتی ہیں۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے: "خُدا اُن کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں"

سوالیہ(؟): یہ علامت سوالیہ جملوں کے آخر میں لگائی جاتی ہے۔جیسے:-

کیا ہے؟

تم کہاں ہو؟

میچ کون جیتا؟ وغیرہ

ندائیہ یا فجائیہ(!): کسی کو مخاطب کرنا ہو تو ندائیہ کی علامت لگائی جاتی ہے اور کسی بھی جذبے؛ محبت، نفرت، حقارت، خوف، تعجب، غصہ، خوشی، تنبیہ یا تحسین کا اظہار کرنا مقصود ہو تو یہ علامت بطور فجائیہ لگائی جاتی ہے۔

لڑکے! ذرا ادھر آؤ۔

خبردار! وہاں خطرہ ہے۔

شاباش! تم ضرور کامیاب ہوگے۔

افسوس! تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا۔

۶۔ درج بالا رموزِ اوقاف کو استعمال کرتے ہوئے کم از کم پانچ جملے لکھیں۔

۷۔ دیے گئے مضمون پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے بتایئے کہ مصنف نے کس حد تک سقراط کی شخصیت اور کارہائے نمایاں کا ذکر کرتے ہوئے قارئین کو متاثر کیا ہے؟

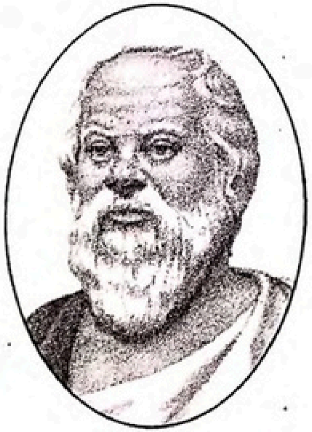

سُقراط

خواجہ حسن نظامی

ولادت: ۱۸۷۸ء

وفات: ۱۹۵۵ء

خواجہ حسن نظامی کا پورا نام سید علی حسن نظامی تھا جب کہ علامہ اقبالؒ نے اُنھیں خواجہ حسن نظامی کا نام دیا اور وہ اسی نام سے مقبول ہوئے۔ اُن کی ولادت دہلی سے تین میل دور بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا میں ہوئی ۔ ابھی خواجہ صاحب کی عمر صرف گیارہ برس تھی کہ اُن کے سر سے ماں باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ بڑے بھائی نے اُن کی پرورش کی۔ خواجہ صاحب نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جہاں تصوف کی حکمرانی تھی۔ اُنھوں نے مرّوجہ علوم کے ساتھ ساتھ تصوف کی تعلیم بھی حاصل کی ۔ منشی غلام نظام الدین (تاجرِ کتب دہلی) کے فیضِ صحبت سے اُن میں ادبی ذوق اور صحافتی میلان پیدا ہوا۔ اُنھوں نے پہلا مضمون ''انڈیا کی نازک حالت'' کے عنوان سے لکھا۔ پھر کچھ عرصے تک ''پیسہ''، ''وکیل'' اور ''مخزن'' نامی رسائل کے لیے لکھتے رہے۔ ''حلقۂ نظام المشائخ'' کے مقاصد کی ترویج کے لیے ۱۹۱۱ء میں اُنھوں نے مصر، شام فلسطین، عرب اور دیگر اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ ۱۹۱۹ء میں ''نظام المشائخ'' کے عنوان سے پہلا ماہنامہ رسالہ جاری کیا۔ اُنھوں نے مختلف اوقات میں چھوٹی بڑی کئی سو کتابیں اور رسالے تصنیف کیے۔

خواجہ صاحب کا تعلق ایک صوفی گھرانے سے تھا اس لیے ایک مقصد کو سامنے رکھ کر اُنھوں نے سادہ، آسان اور عام فہم زبان میں تصوف کے اَسرار و رُموز کو عام لوگوں کے لیے لکھنا شروع کیا۔ اُنھوں نے ایسا دلکش طرزِ تحریر اور پیرایۂ بیان اختیار کیا کہ خشک اور بے کیف اخلاقی اور روحانی مباحث تصوف اور فلسفے سے نکل کر ادب میں داخل ہو گئے۔ اُن کے مضامین کے مقبول ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُنھوں نے

سب سے الگ طرز اختیار کیا۔ جو کچھ لکھا سیدھے سادے اور عام پیرائے میں لکھا، عوام کے لیے لکھا اور ان موضوعات پر لکھا جن پر انسان کی طبیعت خود بخود مائل ہوتی ہے۔ انشا پردازی کے معاملے میں اُنھوں نے کسی کی تقلید نہیں کی۔ وہ انشا پردازی میں عربی اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ استعمال کرنے کے خلاف تھے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے گرد و نواح میں جو کچھ دیکھا مِن و عَن بیان کیا، اُن کے ہاں کہیں بھی تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔

تصانیف: بیگمات کے آنسو، سیپارۂ دل، دہلی کی آخری شمع، بہادر شاہ کا روزنامچہ، دہلی کی سزا، سفرنامۂ حجاز و مصر و شام، جگ بیتی کہانیاں، انگریزوں کی بپتا، محرم نامہ، طمانچہ بر رخسارِ یزید وغیرہ۔

فاقہ میں روزہ

(دہلوی تاجدار کے ایک کنبہ کا فسانہ)

جب دہلی زندہ تھی اور ہندوستان کا دل کہلانے کا حق رکھتی تھی، لال قلعہ پر تیموریوں کا آخری نشان لہرا رہا تھا۔ انھیں دنوں کا ذکر ہے کہ مرزا سلیم بہادر (جو ابوظفر بہادر شاہ کے بھائی تھے) اپنے مردانہ مکان میں بیٹھے ہوئے دوستوں سے بے تکلفانہ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں زنان خانہ سے ایک لونڈی باہر آئی اور ادب سے عرض کیا کہ حضور بیگم صاحبہ یاد فرماتی ہیں۔ مرزا سلیم فوراً محل میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد مغموم واپس آئے۔ ایک بے تکلف ندیم نے عرض کیا: خیر باشد مزاج عالی مکدر پاتا ہوں۔ مرزا نے مسکرا کر جواب دیا: نہیں کچھ نہیں، بعض اوقات اماں حضرت خواہ مخواہ ناراض ہوجاتی ہیں۔ کل شام کو افطاری کے وقت نتھن خاں گویا گا رہا تھا اور مرا دل بہلا رہا تھا۔ اس وقت اماں حضرت قرآن شریف پڑھا کرتی ہیں، ان کو یہ شوروغل ناگوار معلوم ہوا۔ آج ارشاد ہوا ہے کہ رمضان میں گانے بجانے کی محفلیں بند کر دی جائیں۔ بھلا میں اس تفریحی عادت کو کیوں کر چھوڑ سکتا ہوں۔ ادب کے لحاظ سے قبول تو کر لیا، مگر اس کی پابندی سے جی الجھتا ہے۔ حیران ہوں کہ یہ سولہ دن کیوں کر بسر ہوں گے۔

مصاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا: حضور یہ بھی کوئی پریشان ہونے کی بات ہے۔ شام کو افطاری سے پہلے جامع مسجد میں تشریف لے چلا کیجیے، عجب بہار ہوتی ہے۔ رنگ برنگ کے آدمی، طرح طرح کے جمگھٹے دیکھنے میں آئیں گے۔ خدا کے دن ہیں خدا والوں کی بہار بھی دیکھیے۔

مرزا نے اس صلاح کو پسند کیا اور دوسرے دن مصاحبوں کو لے کر جامع مسجد پہنچے۔ وہاں جا کر عجب عالَم دیکھا۔ جگہ جگہ حلقہ بنائے لوگ بیٹھے ہیں۔ کہیں قرآن شریف کے دور ہو رہے ہیں۔ رات کے قرآن سنانے والے حفاظ ایک دوسرے کو قرآن سنا رہے ہیں۔ کہیں مسائل دین پر گفتگو ہو رہی ہے۔ دو عالم کسی فقہی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں اور بیسیوں آدمی بیٹھے مزے سے سن رہے ہیں۔ کسی جگہ توجہ اور مراقبہ کا حلقہ ہے۔ کہیں کوئی صاحب وظائف میں مشغول ہیں۔ الغرض مسجد میں چاروں طرف اللہ والوں کا ہجوم ہے۔

"کُلٌ جَدِیدٌ لَذِیذٌ" مرزا کو یہ نظام بہت پسند آیا اور وقت بہت لطف سے کٹ گیا۔ اتنے میں افطار کا وقت قریب آیا۔ سیکڑوں خوان افطاری کے آنے لگے اور لوگوں میں افطاریاں تقسیم ہونے لگیں۔ خاص محلِ سلطانی سے متعدد خوان، مکلّف چیزوں سے آراستہ روزانہ جامع مسجد میں بھیجے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ قلعہ کی تمام بیگمات اور شہر کے سب امراء علیحدہ افطاری کے سامان بھیجتے تھے۔ اس لیے ان خوانوں کی گنتی سیکڑوں تک پہنچ جاتی تھی اور مسجد میں ان کی عجب آرائش ہوجاتی تھی۔

مرزا کے دل پر اس دینی چرچے اور شان وشوکت نے بڑا اثر ڈالا اور اب وہ برابر روزانہ مسجد میں آنے لگے۔ گھروں میں وہ دیکھتے کہ سیکڑوں فقرا کو سحری اور اول شب کا کھانا، روزانہ شہر کی خانقاہوں اور مسجدوں میں بھجوایا جاتا تھا۔

مرزا سلیم کے ایک بھانجے مرزا شہ زور نوعمری کے سبب اکثر اپنے ماموں کی صحبت میں بے تکلف شریک ہوا کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک تو وہ وقت تھا اور ایک وہ وقت آیا کہ دہلی زیر و زبر ہوگئی۔ قلعہ برباد کر دیا گیا۔ ان کے گھر اکھڑ گئے۔ ان کی بیگمات ماما گیری کرنے لگیں اور مسلمانوں کی سب شان وشوکت تاراج ہوگئی۔ اس کے بعد ایک دفعہ رمضان شریف کے مہینے میں جامع مسجد جانے کا اتفاق ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جگہ جگہ چولھے بنے ہوئے ہیں۔ سپاہی روٹیاں پکا رہے ہیں۔ گھوڑوں کے دانے دلے جا رہے ہیں۔ گھاس کے انبار لگے ہوئے ہیں اور شاہجہاں کی خوب صورت اور بے مثل مسجد اصطبل نظر آتی ہے اور پھر جب مسجد واگذاشت ہوگئی اور سرکار نے اُس کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا، تو رمضان ہی کے مہینے میں پھر جانا

ہوا۔ دیکھا کہ چند مسلمان میلے کچیلے پیوند لگے کپڑے پہنے بیٹھے ہیں۔ دو چار قرآن شریف کا دور کر رہے ہیں اور کچھ اسی پریشان حالی میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ افطاری کے وقت چند آدمیوں نے کھجوریں اور دال سیو بانٹ دیے، کسی نے ترکاری کے قتلے تقسیم کردیے۔ نہ وہ اگلا سا سماں، نہ وہ اگلی سی چہل پہل، نہ وہ پہلے کی سی شان و شوکت، یہ معلوم ہوتا تھا کہ بیچارے فلک کے مارے چند لوگ جمع ہوگئے ہیں۔ اس کے بعد آج کل کا زمانہ بھی دیکھا، جبکہ مسلمان چاروں طرف سے دب گئے ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان، مسجد میں نظر ہی کم آتے ہیں۔ غریب غرباء آئے، تو ان سے رونق کیا خاک ہوسکتی ہے۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ مسجد آباد ہے۔

مرزا شہ زور کی باتوں میں بڑا درد اور اثر تھا۔ ایک دن میں نے ان سے غدر کا قصہ اور تباہی کا فسانہ سننا چاہا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ اس کے بیان کرنے میں عذر و مجبوری ظاہر کرنے لگے۔ لیکن جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اپنی دردناک کہانی اس طرح سنائی:

جب انگریزی توپوں اور سنگینوں نے ہمارے ہاتھ سے تلوار چھین لی، تاج سر سے اتار لیا، تخت پر قبضہ کرلیا۔ شہر میں آتشناک گولیوں کا مینہ برس چکا۔ سات پردوں میں رہنے والیاں، بے چادر ہوکر بازار میں اپنے وارثوں کی تڑپتی لاشوں کو دیکھنے نکل آئیں۔ چھوٹے، بن باپ کے بچے ابا ابا پکارتے ہوئے بے یار و مددگار پھرنے لگے۔ حضور ظل سبحانی، جن پر ہم سب کا سہارا تھا، قلعہ چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ اس وقت میں نے بھی اپنی بوڑھی والدہ، کمسن بہن اور بیوی کو ساتھ لے کر اور اجڑے قافلہ کا سالار بن کر گھر سے کوچ کیا۔

ہم لوگ دو رتھوں میں سوار تھے۔ سیدھے غازی آباد کا رخ کیا، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ راستہ انگریزی لشکر کی جولان گاہ بنا ہوا ہے۔ اس لیے شاہدرہ سے واپس ہوکر قطب صاحب چلے اور وہاں پہنچ کر رات کو آرام کیا۔ اس کے بعد صبح آگے روانہ ہوئے۔

چھترپور کے قریب گوجروں نے حملہ کیا اور سب سامان لوٹ لیا، مگر اتنی مہربانی کی کہ ہم کو زندہ چھوڑ دیا۔ وہ لق و دق جنگل، تین عورتوں کا ساتھ اور عورتیں بھی کیسی ایک بڑھاپے سے دوچار، دو قدم چلنا دشوار، دوسری بیمار، تیسری دس برس کی معصوم لڑکی، زار و قطار عورتیں روتی تھیں اور بین کرکر کے روتی تھیں۔ میرا

کلیجہ ان کے بین سے پھٹا جاتا تھا۔ والدہ کہتی تھیں الٰہی! ہم کہاں جائیں؟ کس کا سہارا ڈھونڈیں؟ ہمارا تاج و تخت لٹ گیا، تو ٹوٹا بوریا اور امن کی جگہ تو دے، اس بیمار کو کہاں لے کر بیٹھوں، اس معصوم بچی کو کس کے حوالے کروں، جنگل کے درخت بھی ہمارے دشمن ہیں، کہیں سایہ نظر نہیں آتا۔ بہن کی یہ کیفیت تھی کہ وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی اور ہم سب کا منہ تکتی تھی۔ مجھ کو اس کی معصومانہ بے کسی پر بڑا ترس آتا تھا۔ آخر مجبوراً میں نے عورتوں کو دلاسا دیا اور آگے چلنے کی ہمت بندھائی۔ گاؤں سامنے نظر آیا۔ غریب عورتوں نے چلنا شروع کیا۔ والدہ صاحبہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی تھیں اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتی تھیں اور جب یہ کہتیں:

”تقدیر ان کو ٹھوکریں کھلواتی ہے جو تاجوروں کے ٹھوکریں مارتے تھے۔ قسمت نے ان کو بے بس کردیا، جو بیکسوں کے کام آتے تھے۔ ہم چنگیز کی نسل ہیں جس کی تلوار سے زمین کانپتی تھی۔ ہم تیمور کی اولاد ہیں جو ملکوں کا اور شہریاروں کا شاہ تھا۔ ہم شاہجہاں کے گھر والے ہیں، جس نے ایک قبر پر جواہر نگار بہار دکھا دی اور دنیا میں بے نظیر مسجد دہلی کے اندر بنادی۔ ہم ہندوستان کے شہنشاہ کے کنبے میں ہیں۔ ہم عزت والے تھے زمین میں ہمیں کیوں ٹھکانا نہیں ملتا۔ وہ کیوں سرکشی کرتی ہے۔ آج ہم پر مصیبت ہے، آج ہم پر آسمان روتا ہے“۔

تو بدن پر رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔ القصہ بہ ہزار دقّت و دشواری گرتے پڑتے گاؤں میں پہنچے (یہ گاؤں مسلمان میواتیوں کا تھا۔ انھوں نے ہماری خاطر کی اور اپنی چوپاڑ میں کچھ روز ان مسلمان گنواروں نے ہمارے کھانے پینے کی خبر رکھی اور چوپاڑ میں ہم کو ٹھہرائے رکھا) لیکن کب تک یہ بار اٹھا سکتے تھے، اکتا گئے اور ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ میاں جی! چوپاڑ ایک برات آنے والی ہے تُو دوسرے چھپر میں چلا جا اور رات دن ٹھالی (بیکار) بیٹھے کیا کرے ہے، کچھ کام کیوں نہیں کرتا؟ میں نے کہا: بھائی جہاں تم کہو گے وہیں جا پڑیں گے، ہمیں چوپاڑوں میں رہنے کی ہوس نہیں، جب فلک نے عالیشان محل چھین لیے، تو اس کچے مکان پر ہم کیا ضد کریں گے اور رہی کام کرنے کی بات سو میرا جی تو خود گھبراتا ہے، خالی بیٹھے ہوئے طبیعت اکتائی جاتی ہے، مجھ کو کوئی کام بتاؤ۔ ہوسکے گا تو آنکھوں سے کروں گا۔ ان کا چودھری بولا: ہم نے کے بیرا

(ہمیں کیا خبر) کہ تو کے کام (کیا کام) کر سکے ہے۔ میں نے جواب دیا: میں سپاہی زادہ تیغ، تفنگ چلانا میرا ہنر ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں جانتا۔ گنوار ہنس کر کہنے لگے: نہ بابا یہاں تو ہل چلانا ہوگا، گھاس کھودنی پڑے گی، ہم نے تلوار کے ہنر کیا کرنے ہیں۔ گنواروں کے اس جواب سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور جواب دیا کہ بھائیو! مجھ کو تو ہل چلانا اور گھاس کھودنی نہیں آتی۔ مجھ کو روتا دیکھ کر گنواروں کو رحم آگیا اور بولے: اچھا تُو ہمارے کھیت کی رکھوالی کیا کر اور تیری عورتیں ہمارے گاؤں کے کپڑے سی دیا کریں۔ فصل پر تجھ کو اناج دے دیا کریں گے، جو تجھ کو برس دن کو کافی ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ میں سارا دن کھیت پر جانور آڑایا کرتا تھا اور گھر میں عورتیں کپڑے سیتی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بھادوں کا مہینا آیا اور گاؤں میں سب کو بخار آنے لگا، میری اہلیہ اور بہن کو بھی بخار نے آن دبایا۔ وہ گاؤں، وہاں دوا اور حکیم کا کیا ذکر۔ خود لُوٹ پیٹ کر اچھے ہوجاتے تھے۔ مگر ہم کو دواؤں کی عادت تھی سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ اسی حالت میں ایک دن اس زور کی بارش ہوئی کہ جنگل کا نالہ چڑھ آیا اور گاؤں میں کمر کمر پانی ہوگیا۔ گاؤں والے تو اس کے عادی تھے لیکن ہماری حالت اس طوفان کے سبب مرنے سے بدتر ہوگئی۔ چونکہ پانی ایک دفعہ ہی رات کے وقت گھس آیا تھا اس لیے ہماری عورتوں کی چارپائیاں بالکل غرقِ آب ہوگئیں۔ آخر بڑی مشکل سے چھپر کی بلّیوں میں دو چارپائیاں اڑا کر عورتوں کو ان پر بٹھایا۔ پانی گھنٹہ بھر میں اتر گیا، مگر غضب یہ ہوا کہ کھانے کا اناج اور اوڑھنے بچھانے کے کپڑے تر کر گیا۔

پچھلی رات میری بیوی کے جاڑے سے بخار آیا۔ اس وقت کی پریشانی بس بیان کرنے کے قابل نہیں۔ اندھیرا گھپ، مینہ کی جھڑی، کپڑے سب گیلے، آگ کا سامان ناممکن۔ حیران تھے الٰہی! کیا انتظام کیا جائے۔ مریضہ کی حالت نہایت ابتر ہوگئی۔ یہاں تک کہ تڑپنے لگی اور تڑپتے تڑپتے جان دے دی۔

چونکہ وہ ساری عمر نازو نعمت میں پلی تھیں، غدر کی مصیبتیں ہی ان کی ہلاکت کے لیے کافی تھیں۔ خیر اس وقت تو جان بچ گئی، مگر یہ بعد کا جھٹکا ایسا برا لگا کہ جان لے کر گیا۔ صبح ہوگئی۔ گاؤں والوں کو خبر ہوئی، تو انھوں نے کفن وغیرہ منگوا دیا اور دوپہر تک یہ محتاج شہزادی گورِ غریباں میں ہمیشہ کے لیے جاسوئی۔

اب ہم کو کھانے کی فکر ہوئی کیونکہ اناج سب بھیگ کر سڑ گیا تھا۔ گاؤں والوں سے بھی مانگتے ہوئے لحاظ آتا تھا۔ وہ بھی ہماری طرح اسی مصیبت میں گرفتار تھے۔

تاہم ہمارے گاؤں کے چودھری کو خود ہی خیال ہوا اور اس نے قطب صاحب سے ایک روپیہ کا آٹا منگوادیا۔ وہ آٹا نصف کے قریب خرچ ہوا ہوگا کہ رمضان شریف کا چاند نظر آیا۔ والدہ صاحبہ کا دل بہت نازک تھا، وہ ہر وقت گزشتہ زمانہ کو یاد کیا کرتی تھیں، رمضان کا چاند دیکھ کر انھوں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہوگئیں۔ میں سمجھ گیا کہ ان کو اگلا وقت یاد آگیا ہے۔ تسلی کی باتیں کرنے لگا، جس سے ان کو کچھ ڈھارس ہوگئی۔

چار پانچ دن تو آرام سے گزر گئے، مگر جب آٹا ختم ہوچکا، تو بڑی مشکل درپیش ہوئی۔ سوال کرتے ہوئے شرم آتی تھی اور پاس ایک کوڑی نہ تھی۔ شام کو پانی سے روزہ کھولا، بھوک کے مارے کلیجا منھ کو آتا تھا۔

والدہ صاحبہ کی عادت تھی کہ اس قسم کی تکلیف کے وقت بین کر کے رویا کرتی تھیں، مگر آج بڑے اطمینان سے خاموش تھیں، ان کی خاموشی واطمینان سے میرے دل کو بھی سہارا ہوا اور چھوٹی بہن کو، جس کے چہرے پر بھوک کے مارے ہوائیاں اڑ رہی تھیں، دلاسا دینے لگا۔ وہ معصوم بھی میرے سمجھانے سے نڈھال ہو کر چارپائی پر جا پڑی اور تھوڑی دیر میں سوگئی۔ بھوک میں نیند کہاں آتی ہے بس ایک غوطہ سا تھا۔

اس غوطہ اور ناتوانی کی حالت میں سحری کا وقت آگیا۔ والدہ صاحبہ اٹھیں اور تہجد کی نماز کے بعد، جن دردناک الفاظ میں انھوں نے دعا مانگی، ان کی نقل کرنا محال ہے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ انھوں نے بارگاہ الٰہی! میں عرض کیا کہ:

”ہم نے ایسا کیا قصور کیا ہے؟ جس کی سزا یہ مل رہی ہے۔ رمضان کے مہینے میں ہمارے گھر سے سیکڑوں محتاجوں کو کھانا ملتا تھا اور آج ہم خود دانے دانے کو محتاج ہیں اور روزہ پر روزہ رکھتے ہیں۔ خداوندا! اگر ہم سے قصور ہُوا ہے، تو اس معصوم بچی نے کیا خطا کی؟ جس کے منھ میں کل سے ایک کھیل اڑ کر نہیں گئی“۔

دوسرا دن بھی یوں ہی گزر گیا اور فاقہ میں روزہ پر روزہ رکھا۔ شام کے قریب چودھری کا آدمی دودھ اور میٹھے چاول لایا اور بولا: آج ہمارے نیاز تھی، یہ اس کا کھانا ہے اور پانچ روپیہ زکوٰۃ کے ہیں۔ ہر سال بکریوں کی زکوٰۃ دیا کرتے ہیں مگر اب کے نقد دے دیا ہے۔

یہ کھانا اور روپے مجھ کو ایسی نعمت معلوم ہوئی گویا بادشاہت مل گئی۔ خوشی خوشی والدہ کے آگے سارا قصّہ کہا۔ کہتا جاتا تھا اور خدا کا شکرانہ بھیجتا جاتا تھا، مگر یہ خبر نہ تھی کہ گردشِ فلاکت نے مرد کے خیال پر تو اثر ڈال دیا، لیکن عورت ذات جوں کی توں اپنی قدیمی غیرت داری پر قائم ہے۔

چنانچہ میں نے دیکھا کہ والدہ کا رنگ متغیر ہوگیا۔ باوجود فاقہ کی ناتوانی کے انھوں نے تیور بدل کر کہا: تُف ہے تیری غیرت پر، خیرات اور زکوٰۃ لے کر آیا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ ارے اس سے مرجانا بہتر تھا۔ اگرچہ ہم مٹ گئے، مگر ہماری حرارت نہیں مٹی۔ میدان میں نکل کر مرجانا یا مار ڈالنا اور تلوار کے زور سے روٹی لینا ہمارا کام ہے، صدقہ خوری ہمارا شیوہ نہیں۔

والدہ کی ان باتوں سے مجھے پسینا آگیا اور شرم کے مارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے۔ چاہا کہ اٹھ کر یہ چیزیں واپس کر آؤں، مگر والدہ نے روکا اور کہا: خدا ہی کو یہ منظور ہے، تو ہم کیا کریں، سب کچھ سہنا ہوگا۔ یہ کہہ کر کھانا رکھ لیا اور روزہ کھولنے کے بعد ہم سب نے مل کر کھالیا۔ پانچ روپے کا آٹا منگوالیا جس سے رمضان خیر وخوبی سے بسر ہوگیا۔

اس کے بعد چھے مہینے گاؤں میں اور رہے، پھر دہلی چلے آئے۔ یہاں آکر والدہ کا انتقال ہوگیا اور بہن کی شادی کر دی۔ انگریزی سرکار نے میری بھی پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی ہے، جس پر آج کل زندگی کا انحصار ہے۔

(بیگمات کے آنسو)

NOT FOR SALE

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

(الف) مرزا سلیم والدہ کی باتوں سے کیوں آزردہ تھا؟

(ب) مغلیہ دور میں رمضان میں جامع مسجد میں کیا سماں ہوتا تھا؟

(ج) ۱۸۵۷ء کے بعد رمضان میں جامع مسجد کی کیا حالت تھی؟

(د) مرزا شہ زور کون تھے؟

(ہ) میواتیوں نے مرزا شہ زور کے خاندان سے کیسا برتاو کیا؟

۲۔ خالی جگہ پُر کریں:

(الف) مرزا سلیم ______ میں گانے بجانے کی محفلیں سجاتے۔

(ب) مصاحب کے کہنے پر مرزا سلیم ______ جانے لگے۔

(ج) مرزا شہ زور کی والدہ مرزا سلیم کی ______ تھی۔

(د) انگریز ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو ______ کہتے ہیں۔

(ہ) ______ نے مرزا شہ زور اور اُس کے خاندان کا سارا مال و اسباب لُوٹ لیا۔

(و) مغل خاندان ______ کی نسل سے تھا۔

۳۔ درج ذیل رموزِ اوقاف کی وضاحت کریں:

رابطہ، تفصیلیہ، قوسین، خط۔

۴۔ اس سبق کا خلاصہ لکھیں۔

۵۔ اپنے کسی قریبی دوست، استاد، عزیز یا رشتے دار کی شخصیت پر ایک مضمون تحریر کریں۔

NOT FOR SALE

مولانا صلاح الدین احمد

ولادت: ۱۹۰۲ء

وفات: ۱۹۶۴ء

مولانا صلاح الدین احمد لاہور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی احمد بخش تھا۔ اُنھوں نے پنجاب نیشنل کالج لاہور سے بی۔ اے کیا۔ وہ ابتدا سے ہی اُردو زبان و ادب کے شیدائی تھے۔ اُنھوں نے طالب علمی کے زمانے سے ہی ایک رسالہ ''خیالستان'' کے نام سے جاری کیا۔۱۹۳۴ سے اُنھوں نے ''ادبی دُنیا'' کی اِدارت سنبھالی اور آخری دم تک اُسے مرتّب اور شائع کرتے رہے۔ اُن کا ایک اہم کارنامہ ''اکادمی پنجاب'' کا قیام ہے۔ اس انجمن کے تحت اُنھوں نے اُردو کی قدیم اور نادر کتابوں کو ازسرِ نو شائع کیا۔ وہ '' اُردو پڑھو، اُردو بولو'' تحریک کے سرخیل تھے، جس کی وجہ سے اُنھیں ''پنجاب کا بابائے اُردو'' بھی کہا جاتا ہے۔

وہ ایک اعلیٰ درجے کے مقالہ نگار تھے۔ اُنھوں نے ادبی اور قومی موضوعات پر سینکڑوں مقالے لکھے ہیں۔ وہ صحتِ زبان اور آرائشِ زبان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بہت سے ادیبوں نے ادب وتنقید کا فن اُن کے زیرِ نگرانی سیکھا۔ رسالہ ''ادبی دُنیا'' نے بہت سے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی رہنمائی کی۔

تصانیف: تصوّراتِ اقبالؒ، افسانوی ادب، محمد حسین آزاد وغیرہ

پھر وطنیّت کی طرف

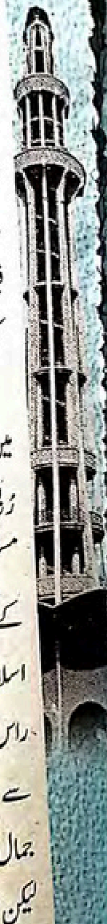

پاکستان کے قیام سے پہلے اسلامیانِ ہند کے دل جس جذبے سے سرشار تھے، وہ وحدتِ ملّت کا جذبہ تھا اور اگرچہ اس جذبے نے ہمارے فکر وشعور سے وطنیت کو یکسر مٹادیا لیکن یہی جذبہ بالآخر ہمارے قومی وطن کے قیام کا باعث بنا۔ تاریخ کا یہ ایک حیرت انگیز معما اور ایک گہرا راز ہے جسے پوری صحت اور قطعیت سے حل کرلینا ممکن نہیں۔ بہرحال جہاں تک ہماری زندگی کے موجودہ تقاضوں کا تعلق ہے، آج اس بات کا فیصلہ کرلینا نہ صرف موزوں بلکہ ضروری ہے کہ ہمارا قومی نصب العین کیا ہے؟ یا اس کے حصول کا سیدھا راستہ کون سا ہے؟ اور ہماری وطنیت اور ملت اس کی کس حد تک معاون یا مخالف ہوسکتی ہے؟

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے، اسلامی ہند میں جذبۂ ملّت کا فروغ اور پھر اس فروغ کے نتیجے میں ایک قومی وطن کی آفرینش بظاہر ایک تاریخی معمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ پاکستان کے قیام سے کم وبیش رُبع صدی پیشتر اُس مردِ عظیم کے افکار، جس نے ہمیں پاکستان کا تصور دیا، وطن اور وطنیت کے استخفاف کو مسلسل اپنا محور بنا رہے تھے، لیکن جب مفکرِ اسلام نے اپنے شاعرانہ الہامات کی موجودگی میں ایک وقفۂ قلیل کے لیے مسلمانانِ ہند کی عملی سیاسیات کی طرف اپنی توجہ مبذول کی، تو انھیں شمال مغربی ہندوستان نے ایک اسلامی وطن کے قیام کی دعوت دی۔ یہاں میں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا کہ یہ دعوت جمرود سے لے کر راس کماری تک تمام اسلامیانِ ہند کے لیے تھی یا صرف انھی اقطاع کے باشندوں کے لیے جو دریائے سندھ سے لے کر دریائے جمنا تک آباد تھے اور وہ خواب جسے ٹیپو سلطانؒ نے بھی دیکھا اور عبدالحمید ثانیؒ نے بھی، جمال الدین افغانیؒ نے بھی دیکھا اور خود مفکرِ اسلام علامہ اقبالؒ نے بھی، کس کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے والا تھا؟ لیکن ایک بات بالکل صاف اور عیاں ہے اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ملت اور مقاصدِ ملت

کے امکاناتِ فروغ کے سلسلے میں جب شاعرِ مشرق نے جذبات سے افکار کی طرف انحراف کیا، تو اسے مومن کی ترک تازی کے لیے اس جہان کی وسعتیں اور اس کے سفینے کے سفر کے لیے بحرِ امکاں کی ناپیدا کناریاں بے کار اور بے معنی نظر آئیں اور اس نے اپنے تاریخی خطبے میں مسلمانوں کو اس ملک کے شمال مغربی کونے میں ایک قومی وطن کی تاسیس وتشکیل کی دعوت دی۔ شاعر آسمان کی بلندیوں اور وسعتوں سے اُتر کر زمین کے ایک تنگ ٹکڑے کی حدود میں ملّت اور اس کے مفاد کو محصور و محدود کرنے پر نہ صرف آمادہ ہوگیا، بلکہ اسی میں اُس کو اِس کی نجات بھی نظر آئی۔

زمین آخر زمین ہے اور ہمارے تخیل کی ہزار پروازیں ہماری آرزوؤں کی ہزار رفعتیں بھی اسے آسمان نہیں بناسکتیں اور حقیقت کی دنیا میں ہمیں آسمان سے زیادہ ضرورت بھی زمین ہی کی ہے، تاکہ آسمان کی بادشاہت زمین پر قائم ہو اور اللہ تعالیٰ کی اس زمین پر اس کے فرماں بردار بندے مُتصرف ہو کر اُسے اپنا وطن بنائیں اور اس وطن کی حفاظتِ میں، اگر ضرورت پڑے، تو اپنی جانیں، اپنا مال اور اپنی اولاد قربان کردیں۔

اقبالؒ نے جب ہمیں پاکستان کا تصور دیا تو یہ بلاشبہ اس کے آفاق گیر تصورِ ملّت سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا، لیکن اس کی رُجعتّ ایک حقیقت پرستانہ رُجعت تھی۔ ملتِ اسلامیہ ہند کو اپنے تحفظ اور اپنے فروغ کے تقاضے پورے کرنے کے لیے کسی بحرِ بے پایاں یا کسی آسمانِ بے کراں کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ ایک ایسے خطہء زمین کی حاجت تھی، جس میں سما کر یا سمٹ کر، پھیل کر یا بٹ کر اُسے ایک آزاد اسلامی زندگی بسر کرنی تھی۔

خداوند تعالیٰ کے فضل و احسان سے ہماری یہ ضرورت ایک حد تک پوری ہوئی۔ یہاں اس بحث میں الجھنا بے سود ہوگا کہ ہم میں سے کتنے اس نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ مند ہوئے، لیکن جس قدر بھی بہرہ مند ہوسکے، اُن کے لیے نجات و فلاح کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ راستہ وطن کی والہانہ محبت کے مرغزار میں ہو کر نکلتا اور اس فوزِ عظیم کی طرف بڑھتا ہے، جو مومن کی منزلِ مقصود ہے۔

جب اپنے ملی مفاد کی حفاظت اور اپنے ملّی مقاصد کے فروغ کے لیے ہم نے ایک وطن حاصل کرلیا ہے، خواہ وہ ہم سب کے لیے کافی ہے یا ناکافی، تو منطقی طور پر ہمارے لیے یہ لازم ہوجاتا ہے کہ ہم اس کے تحفظ اور اس کے فروغ کو تمام دیگر فرائض پر ترجیح دیں کیونکہ نہ صرف ہمارے اعمالِ حسنہ، نہ صرف ہمارے مقاصدِ ملّی، بلکہ خود ہماری ہستی، ہماری جانیں اور ہمارے جسم، ہمارے گھر بار اور ہمارے مواقع اور ہمارے امکانات اس کی سلامتی سے وابستہ ہیں۔ اگر ہمارا وطن قائم رہے گا، تو ہمیں خدمتِ دین اور تعمیرِ ملت کے موقعے بھی ملیں گے، ہم اعلائے کَلِمَۃُ اللہ بھی کرسکیں گے اور حقوقِ انسانیت بھی ادا کرپائیں گے، لیکن اگر خدانخواستہ وطن کو ضعف پہنچا یا ملک پر آفت آئی، تو نہ ہم بچے رہیں گے اور نہ ہماری مسلمانی اور خاکم بدہن، ملک کا زوال، ملت کا زوال بن جائے گا۔

جہاں تک اس برِ عظیم کا تعلق ہے، قیامِ پاکستان کے بعد ہمارا محاذ یکسر بدل چکا ہے۔ اب وطن اور ملت کے مفاد متضاد نہیں رہے بلکہ ہم آہنگ ہوگئے ہیں اور ایک کا فروغ، دوسرے کی ترقی کا ضامن ہوچکا ہے۔ اس کے ساتھ ہم پر ایک نئی ذمہ داری بھی عائد ہوگئی ہے اور وہ ہے ایک کروڑ غیر مسلم پاکستانیوں کی ذمہ داری۔ ظاہر ہے کہ قیامِ پاکستان میں اُن کی کسی قسم کی آرزوؤں نے حصہ نہیں لیا بلکہ وہ خود بخود اس کے حصے میں آگئے۔ اُنھیں مفید شہری بنانے کے لیے اور اُن کے اور اپنے درمیان ایک بنیادی ہم آہنگی اور ہم مقصدی کے لیے لازم ہے کہ ہمارے سامنے ایک مشترکہ نصب العین ہو، جس کے تقدس سے نہ انھیں مجالِ انکار ہو اور نہ ہمیں یارائے انحراف۔ ظاہر ہے کہ یہ نصب العین وطن پروری اور وطن دوستی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟ یہی نصب العین ان کی وفاداری کا ضامن اور مملکت کی سلامتی کا سہارا ہوگا اور اسی وجہ سے ملک کی اکثریت اور اقلیت ہاتھوں میں ہاتھ دیے آگے بڑھیں گی اور ملک کی فلاح و بہبود میں برابر کا حصہ لیں گی۔

اب کہ ہم آزاد ہیں، ہماری وطن دوستی ہمارے ملی روابط پر غالب نہ آئے گی اور نہ انھیں نقصان پہنچائے گی۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم شاعرِ اسلام کی اس آرزو کو بر لانے کے لیے ہمیشہ سربکف رہیں گے۔

ایک ہوں مسلم ، حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر

(تصوراتِ اقبالؒ)

مشق

۱۔ **درج ذیل کے مختصر جوابات دیں:**

(الف) پاکستان کے قیام سے پہلے اسلامیانِ ہند کے دل کس جذبے سے سرشار تھے؟

(ب) ہمارا قومی نصب العین کیا ہے؟

(ج) قومی نصب العین کے حصول کا سیدھا راستہ کون سا ہے؟

(د) ہمیں ''پاکستان'' کا تصور کس نے دیا؟

(ہ) اقبالؒ نے مسلمانانِ ہند کی عملی سیاسیات کی طرف اپنی توجہ کیوں مبذول کی؟

(و) اقبالؒ کا تصورِ پاکستان اس کے آفاق گیر تصورِ ملت سے کیوں نسبت نہیں رکھتا تھا؟

(ز) جب ہم نے آزاد وطن پاکستان حاصل کرلیا تو بقولِ مصنف اب منطقی طور پر ہمارے لیے کیا لازم ہے؟

(ح) ٹیپو سلطانؒ، سلطان عبدالحمید ثانیؒ ، سید جمال الدین افغانیؒ اور علامہ اقبالؒ کس مشترک تصوّر کے مبلّغ تھے؟

۲۔ درج ذیل سوالات کے مفصل جواب تحریر کریں:

(الف) مضمون میں مصنف نے کن اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے؟

(ب) پاکستان کا قیام برصغیر کے مسلمانوں کے لیے کیوں ضروری تھا؟

(ج) ملتِ اسلامیہ کے اتحاد کے ضمن میں پاکستان کیا کردار ادا کرسکتا ہے؟

(د) بقولِ مصنف ہم کیوں کر اعلائے کلمتہ اللہ کرسکیں گے؟

(ہ) ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے — نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر
یہ شعر کس شاعر کا ہے؟ اس مضمون کے تناظر میں شعر کا مفہوم واضح کریں۔

۳۔ درج ذیل جملوں میں امدادی افعال کی نشاندہی کریں:

(الف) میں نے سلیم کو زمین پر پٹخ دیا۔

(ب) اُسے اپنی بات واضح کرنے دو۔

(ج) اندھا اچانک گڑھے میں گر پڑا۔

(د) جاگ اُٹھا ہے سارا وطن ساتھیو!

(ہ) جو میں نے سنا ہے وہ مجھ سے بیان نہیں ہوسکتا۔

۴۔ درج ذیل الفاظ پر اِعراب لگائیں۔

وطنیت، مفکر اسلام، متصرف، تصورِملت، تحفظ، برعظیم۔

رموزِ اوقاف:

قوسین ( ): قوسین، قوس (کمان) کی جمع ہے۔

- عبارت میں ایسا جملہ یا بیان جس کا اصل مضمون سے تعلق نہ ہو، یا جملۂ معترضہ کو قوسین میں لکھا جاتا ہے۔ مثلاً:

احمد کے والد (جو کہ ڈاکٹر ہیں) کل سعودی عرب جا رہے ہیں۔

خط (—):

- یہ علامت جملۂ معترضہ کے پہلے اور آخر میں لگائی جاتی ہے۔ مثلاً:-

میری رائے میں — اگرچہ میں ماہرِ تعلیم تو نہیں ہوں — ہمارے نظامِ تعلیم میں بہت سی خامیاں ہیں۔

- جب ایک لفظ کی وضاحت میں کئی دیگر الفاظ استعمال ہوں تو لفظ کے بعد یہ نشان لگاتے ہیں۔

سارا مکان — دیواریں، فرنیچر، پردے اور بجلی کا سامان — سب جل کر راکھ ہو گیا۔

سلیم — بلکہ اس کا سارا خاندان — سعودی عرب چلا گیا۔

٦۔ درج بالا رموزِ اوقاف کو مدِّنظر رکھتے ہوئے دو دو جملے تحریر کریں۔

NOT FOR SALE

مولانا محمد حسین آزاد

ولادت: ۱۸۳۱ء

وفات: ۱۹۱۰ء

محمد حسین آزاد دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی محمد باقر تھا، جو ایک جید عالم اور مجتہد تھے۔ ان کے والد کے شیخ محمد ابراہیم ذوق سے دوستانہ مراسم تھے، اس لیے آزاد نے ذوق کی زیرِ نگرانی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں دہلی کالج میں داخل ہو کر عربی و فارسی کی تحصیل کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آزاد کے والد کی شہادت اور گھر کی تباہی کے بعد انھیں دہلی چھوڑنی پڑی۔ مختلف علاقوں میں قیام کیا۔ سات سال بعد لاہور آئے اور بڑی مشکل سے محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ یہاں انھوں نے عربی اور فارسی میں کچھ درسی کتب لکھیں، جو بہت مقبول ہوئیں۔ لاہور میں انجمنِ پنجاب کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ آزاد کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں شمس العلما کا خطاب ملا۔ اپنی ایک جوان اور چہیتی بیٹی کے انتقال سے انھیں بے حد صدمہ پہنچا اور وہ ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ تاہم اس دوران میں جب بھی افاقہ ہوتا تو تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھتے۔

آزاد عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ وہ سنسکرت اور ہندی زبان و ادب کی خوبیوں سے بھی آشنا تھے۔ وہ اُردو اور دیگر مشرقی زبانوں کے بڑے محقق اور ماہر تھے۔ اُن کا شاہکار ”آبِ حیات“ اُردو زبان کی پہلی تاریخی اور تنقیدی و تحقیقی کتاب ہے۔ آزاد کی انشاپردازی بے مثل ہے، وہ ایک ایسے طرز کے بانی تھے، جس کا خاتمہ انھیں کے ساتھ ہوا۔ اس طرز سے انھوں نے تمثیلی اور تخیلی مضامین میں خوب کام لیا۔

تصانیف: نیرنگِ خیال، سخن دانِ فارس، دربارِ اکبری، نگارستان، آبِ حیات وغیرہ۔

NOT FOR SALE

شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار

اے ملکِ فنا کے رہنے والو! دیکھو اس دربار میں تمھارے مختلف فرقوں کے عالی وقار جلوہ گر ہیں۔ بہت سے حب الوطن کے شہید ہیں، جنھوں نے اپنے ملک کے نام پر میدان جنگ میں جا کر خونی خلعت پہنے۔ اکثر مصنف اور شاعر ہیں اور بے عیبی سے زندگی بسر کر گئے۔ ایسے زیرک اور دانا بھی ہیں جو بزمِ تحقیق کے صدر اور اپنے عہد کے باعث فخر رہے۔

بقائے دوام دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی کہ اس کے لیے فنا نہیں، دوسری عالمِ یادگار کی بقا، جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں۔

ناموران موصوف کے حالات ایسے دل پر چھائے ہوئے تھے کہ انھوں نے مجھے سوتے سوتے چونکا دیا۔ میں اس عالم میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ چونکہ بیان اس کا لطف سے خالی نہیں، اس لیے عرض کرتا ہوں:

''خواب میں دیکھتا ہوں کہ گویا میں ہوا کھانے چلا ہوں اور چلتے چلتے ایک میدانِ وسیع الفضا میں جا نکلا ہوں جس کی وسعت اور دلفزائی میدان خیال سے بھی زیادہ ہے۔ دیکھتا ہوں کہ میدان مذکور میں اس قدر کثرت سے لوگ جمع ہیں کہ نہ انھیں محاسبِ فکر شمار کر سکتا ہے، نہ قلمِ تحریر فہرست تیار کر سکتا ہے اور جو لوگ اس میں جمع ہیں وہ غرض مند لوگ ہیں کہ اپنی اپنی کامیابی کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک پہاڑ ہے جس کی چوٹی گوشِ سحاب سے سرگوشیاں کر رہی ہے۔ پہلو اس کے جس طرف سے دیکھو، ایسے سرپھوڑ اور سینہ توڑ ہیں کہ کسی مخلوق کے پاؤں نہیں جمنے دیتے۔ ہاں حضرتِ انسان کے ناخنِ تدبیر کچھ کام کر جائیں تو کر جائیں۔ یکا یک قلہ کوہ سے ایک شہنائی کی سی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ دلکش آواز سب کو بے اختیار اپنی

طرف کھینچتی تھی۔ اس طرح کہ دل میں جان اور جان میں زندہ دلی پیدا ہوتی تھی بلکہ خیال کو وسعت کے ساتھ ایسے رفعت دیتی تھی۔ جس سے انسان مرتبۂ انسانیت سے بھی بڑھ کر قدم مارنے لگتا، لیکن یہ عجب بات تھی کہ اتنے انبوہِ کثیر میں سے تھوڑے ہی اشخاص تھے جن کے کان اس کے سننے کی قابلیت اور اس کے نغموں کا مذاق رکھتے تھے۔

دوسری طرف جو نظر جا پڑی تو دیکھتا ہوں کہ کچھ خوبصورت عورتیں ہیں اور بہت سے لوگ ان کے تماشائے جمال میں محو ہو رہے ہیں۔ یہ عورتیں پریوں کا لباس پہنے ہیں مگر یہ بھی وہیں چرچا سنا کہ درحقیقت نہ وہ پریاں ہیں، نہ پری زاد عورتیں ہیں۔ کوئی ان میں غفلت، کوئی عیاشی ہے۔ کوئی خود پسندی، کوئی بے پروائی ہے۔ جب کوئی ہمت والا ترقی کے رستے میں سفر کرتا ہے تو یہ ضرور ملتی ہیں۔ انھی میں پھنس کر اہل ترقی اپنے مقاصد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا کہ جو لوگ ان جعلی پریوں کی طرف مائل ہیں، وہ اگرچہ اقوام مختلفہ اور عہد ہائے متفرقہ، عمر ہائے متفاوتہ رکھتے ہیں، مگر وہی ہیں جو حوصلے کے چھوٹے، ہمت کے ہیٹے اور طبیعت کے پست ہیں۔

دوسری طرف دیکھا کہ جو بلند حوصلہ، صاحبِ ہمت، عالی طبیعت تھے وہ ان سے الگ ہو گئے اور غول کے غول شہنائی کی آواز کی طرف بلندیٔ کوہ پر متوجہ ہوئے۔ جس قدر یہ لوگ آگے بڑھتے تھے، اُسی قدر وہ آواز کانوں کو خوش آئند معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا ہے کہ بہت سے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص اس ارادے سے آگے بڑھے کہ بلندیٔ کوہ پر چڑھ جائیں اور جس طرح ہو سکے، پاس جا کر اس نغمۂ آسمانی سے قوتِ روحانی حاصل کریں۔ چنانچہ سب لوگ کچھ کچھ چیزیں اپنے ساتھ لینے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگے کے راستے کا سامان لے رہے ہیں۔ سامان بھی ہر ایک کا الگ الگ تھا۔ کسی کے ہاتھ میں شمشیر برہنہ تھی۔ ایک کے ہاتھ میں نشان تھا۔ کسی کے ہاتھوں میں کاغذوں کے اجزا تھے۔ کسی کی بغل میں ایک علم تھی۔ کوئی پنسلیں لیے تھا۔ کوئی جہازی قطب نما اور دُوربین سنبھالے تھا۔ بعضوں کے سر پر تاجِ شاہی دھرا تھا۔ بعضوں کے تن پر لباسِ جنگی آراستہ تھا۔ غرض کہ علمِ ریاضی اور جرِ ثقیل کا کوئی آلہ نہ تھا جو اس

وقت کام میں نہ آرہا ہو۔ اس عالم میں دیکھتا ہوں کہ ایک فرشتہ رحمت میرے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑا ہے اور مجھے بھی اس بلندی کا شائق دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ سرگرمی اور گرمجوشی تمھاری ہمیں نہایت پسند ہے۔ اس نے یہ بھی صلاح دی کہ ایک نقاب منہ پر ڈال لو۔ میں نے بے تامل تعمیل کی۔ بعد اس کے گروہ مذکور فرقے فرقے میں تقسیم ہوگیا۔ کوہ مذکورہ پر راستوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ سب نے ایک ایک راہ پکڑ لی۔

مسافر جلد جلد آگے بڑھے اور ایک سپاٹے میں پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے۔ اس میدان روح افزا میں پہنچتے ہی ایسی جان بخش اور روحانی ہوا چلنے لگی جس سے روح اور زندگانی کو قوت دوامی حاصل ہوتی تھی۔ تمام میدان جو نظر کے گرد و پیش دکھائی دیتا تھا، اس کا رنگ کبھی نورِ سحر تھا اور کبھی شام وشفق جس سے قوسِ قزح کے رنگ میں کبھی شہرت عام اور کبھی بقائے دوام کے حروف عیاں تھے۔ یہ نور و سرور کا عالم دل کو اس طرح تسلی وتشفی دیتا تھا کہ خود بخود پچھلی محنتوں کے غبار دل سے دھوئے جاتے تھے اور اس مجمع عام میں امن وامان اور دلی آرام پھیلتا تھا۔ جس کا سرور لوگوں کے چہروں سے پھولوں کی شادابی ہو کر عیاں تھا۔ ناگہاں ایک ایوانِ عالی شان دکھائی دیا کہ اس کے چاروں طرف پھاٹک تھے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا کہ پھولوں کے تختے میں ایک پری، حور شمائل چاندی کی کرسی پر بیٹھی ہے اور وہی شہنائی بجا رہی ہے۔ جس کے میٹھے میٹھے سروں نے اُن مشتاقوں کے انبوہ کو یہاں تک کھینچا تھا۔ پری ان کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی اور سروں سے اب ایسی صدا آتی تھی گویا آنے والوں کو آفرین وشاباش دیتی ہے اور کہتی ہے کہ "خیر مقدم! خیر مقدم! خوش آمدید! صفا آورد دید" اس آواز سے یہ خدائی لشکر کئی فرقوں میں منقسم ہوگیا۔ چنانچہ مؤرخوں کا گروہ ایک دروازے پر ایستادہ ہوا تا کہ صاحبِ مراتب اشخاص کو حسبِ مدارج ایوانِ جلوس میں داخل کرے۔ یکا یک وہ شہنائی جس سے کبھی شوق انگیز جوش خیز اور کبھی جنگی باجوں کے سر نکلتے تھے، اب اس سے ظفریابی اور مبارکبادی کی صدا آنے لگی۔ تمام مکان گونج اُٹھا اور دروازے خود بخود کھل گئے۔

دیکھا کہ ایک تختِ طلسمات کو بتیس پریاں اڑائے لیے آتی ہیں۔ اس پر ایک راجا بیٹھا ہے مگر نہایت دیرینہ سال۔ اسے فرقے فرقے کے علما اور مؤرخ لینے کو نکلے مگر پنڈت اور مہاجن لوگ بہت بے قراری

سے دوڑے۔ معلوم ہوا کہ راجا تو مہاراجا بکر ماجیت تھے اور تخت سنگھاسن بتیسی۔ پریاں اتنی بات کہہ کر ہوا ہو گئیں کہ جب تک سورج کا سونا اور چاند کی چاندی چمکتی ہے، نہ آپ کا سنہ ہٹے گا، نہ سکّہ مٹے گا۔ برہمنوں اور پنڈتوں نے تصدیق کی اور انھیں لے جا کر ایک مسند پر بٹھا دیا۔

ایک راجا کے آنے پر لوگوں میں کچھ قیل وقال ہوئی کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اپنے دو مصاحبوں کو بھی ساتھ لے جائے اور اراکین دربار کہتے تھے کہ یہاں تمکنت اور غرور کا گزر نہیں۔ اتنے میں وہی بتیس پریاں پھر آئیں۔ چنانچہ ان کی سفارش سے اسے بھی لے گئے۔ جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا، ایک پنڈت آیا۔ دونوں ہاتھ اُٹھا کر اشیر باد کہی اور بقائے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا۔ جس میں ہیرے اور پنّے کے نو دانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ راجہ بھوج تھے اور بتیس پریوں کا جھرمٹ وہی کتاب سنگھاسن بتیسی تھی جو ان کے عہد میں تصنیف ہوئی اور جس نے تاج سر پر رکھا، وہ کالی داس شاعر تھا جس نے ان کے عہد میں نو (9) کتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگیٔ جاوید بخشی ہے۔

اس طرف تو برابر کا یہی کاروبار جاری تھا۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ دوسرے دروازے سے بھی داخلہ شروع ہوا۔ میں اس طرف متوجہ ہوا۔ دیکھتا ہوں کہ وہ کمرہ بھی فرش فروش، جھاڑ فانوس سے بقعۂ نور بنا ہے۔ ایک جوان، پیل پیکر ہاتھ میں گرزِ گاؤسر نشۂ شجاعت میں مست جھومتا جھومتا چلا آتا ہے۔ جہاں قدم رکھتا ہے، ٹخنوں تک زمین میں ڈوب جاتا ہے۔ گرد اس کے شاہانِ کیانی اور پہلوانانِ ایرانی موجود ہیں کہ درفشِ کاویانی کے سایۂ بے زوال میں لیے آتے ہیں۔ حُبِّ قوم اور حُبِّ وطن اس کے دائیں بائیں پھول برساتے تھے۔ اس کی نگاہوں سے شجاعت کا خون ٹپکتا تھا اور سر پر کلۂ شیر کا خود فولادی دھرا تھا۔ مؤرخ اور شعرا اس کے انتظار میں دروازے پر کھڑے تھے۔ سب نے اسے بچشم تعظیم دیکھا۔ انھی میں سے ایک پیرمرد دیرینہ سال جس کے چہرے سے مایوسی اور ناکامی کے آثار نمایاں تھے، وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا اور ایک کرسی پر بٹھایا، جسے بجائے پایوں کے چار شیر کندھوں پر اٹھائے کھڑے تھے۔ پھر پیرمرد نے اہلِ مجلس کی طرف متوجہ ہو کر چند اشعار نہایت زور شور کے پڑھے۔ نہیں، بلکہ اس کے کارناموں کی تصویر صفحۂ ہستی پر ایسے رنگ سے کھینچی جو قیامت تک رہے گی۔ بہادر

پہلوان نے اٹھ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور گلِ فردوس کا ایک طرّہ اس کے سر پر آویزاں کر کے دُعا کی کہ الٰہی! یہ بھی قیامت تک شگفتہ و شاداب رہے ۔ تمام اہلِ محفل نے آمین کہی۔ معلوم ہوا کہ وہ بہادر ایران کا حامی شیر سیستانی رستم پہلوان ہے اور کہن سال مایوس فردوسی ہے جو شاہنامہ لکھ کر اس کے انعام سے محروم رہا۔

بعد اس کے ایک نوجوان آگے بڑھا جس کا حُسنِ شباب نوخیز اور دل بہادری اور شجاعت سے لبریز تھا۔ سر پر تاج شاہی تھا مگر اس سے ایرانی پہلوانی پہلو چراتی تھی۔ ساتھ اس کے حکمت یونانی سر پر چتر لگائے تھی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا مگر سب اسے دیکھ کر ایسے محو ہوئے کہ کسی نے جواب نہ دیا۔ بہت سے مورّخ اور محقق اس کے لینے کو بڑھے مگر سب ناواقف تھے۔ وہ اس تخت کی طرف لے چلے جو کہانیوں اور افسانوں کے ناموروں کے لیے تیار ہوا تھا۔ چنانچہ ایک شخص جس کی وضع اور لباس سب سے علیحدہ تھا، ایک انبوہ کو چیر کر نکلا۔ وہ کوئی یونانی مورّخ تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے جا کر سب سے پہلی کرسی پر بٹھا دیا۔ فرشتہ رحمت نے میرے کان میں کہا کہ تم اس گوشے کی طرف آجاؤ تا کہ تمھاری نظر سب پر پڑے اور تمھیں کوئی نہ دیکھے۔ یہ سکندر یونانی ہے جس کے کارنامے لوگوں نے کہانی اور افسانے بنا دیے ہیں۔

اس کے پیچھے پیچھے ایک بادشاہ آیا کہ سر پر کلاہِ کیانی اور اس پر درفشِ کاویانی جھومتا تھا مگر پھریرا علم کا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح آتا تھا کہ گویا اپنے زخم کو بچاتے ہوئے آتا ہے۔ رنگ زرد تھا اور شرم سے سر جھکائے تھا۔ جب وہ آیا تو سکندر بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو اٹھا اور اپنے برابر بٹھایا۔ باوجود اس کے جس قدر سکندر زیادہ تعظیم کرتا تھا، اُس کی شرمندگی زیادہ ہوتی تھی ۔ وہ دارا بادشاہِ ایران تھا۔

بعد اس کے جو شخص آیا، اگرچہ وہ سادہ وضع تھا مگر قیافہ روشن اور چہرہ فرحتِ روحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا ۔ جو لوگ اب تک آچکے تھے، ان سب سے زیادہ عالی رتبے کے لوگ اس کے ساتھ تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ پر افلاطون تھا اور بائیں پر جالینوس۔ اس کا نام سقراط تھا۔ چنانچہ وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا۔ لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ ارسطو اپنے اُستاد یعنی افلاطون سے دوسرے درجے پر بیٹھے گا مگر اس مقدمے پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے کہ ان کا سرگروہ خود ارسطو تھا۔ اس منطق زبردست نے کچھ شوخی اور کچھ سینہ زوری

سے مگر دلائلِ زبردست اور براہین معقول کے ساتھ سب اہلِ محفل کو قائل کر لیا کہ یہ مسند میرا ہی حق ہے۔

ایک گروہ کثیر بادشاہوں کی ذیل میں آیا۔ سب جبہّ و عمامہ اور طبل و دمامہ رکھتے تھے مگر باہر روکے گئے کیونکہ ہر چند ان کے جبے دامنِ قیامت سے دامن باندھے تھے اور عمامے گنبدِ فلک کا نمونہ تھے مگر اکثر اُن میں طبلِ تہی کی طرح اندر سے خالی تھے۔ چنانچہ دو شخص اندر آنے کے لیے منتخب ہوئے۔ اُن کے ساتھ انبوہِ کثیر علما و فضلا کا ہو لیا۔ پہلا بادشاہ اُن میں ہارون الرشید اور دوسرا مامون الرشید تھا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک اور تاجدار سامنے سے نمودار ہوا ۔ ولایتی اِستخوان اور ولایتی لباس تھا اور جامہ، خون سے قلمکار تھا۔ ہندوستان کے بہت سے گراں بہا زیور اس کے پاس تھے مگر چونکہ ناواقف تھا، اس لیے کچھ زیور ہاتھ میں لیے تھے۔ کچھ کندھے پر پڑے تھے۔ وہ محمود غزنوی تھا۔ بہت سے مصنف اس کے استقبال کو بڑھے مگر وہ کسی اور کا منتظر اور مشتاق معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک نوجوان، حور شمائل آیا اور فردوسی کا ہاتھ پکڑ کر محمود کے سامنے لے گیا۔ محمود نے نہایت اشتیاق اور شکر گزاری سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اگرچہ برابر بیٹھ گئے مگر دونوں کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ نوجوان ایک عجیب ناز و انداز سے مسکرایا اور چلا گیا۔ وہ ایاز تھا۔

اسی عرصے میں ایک اور شخص آیا کہ لباس اہلِ اسلام کا رکھتا تھا مگر چال ڈھال یونانیوں سے ملتا تھا اس کے داخل ہونے پر شعرا تو الگ ہوگئے مگر تمام علما و فضلا میں تکرار اور قیل وقال کا غل ہوا۔ اس سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا اور ارسطو کے مقابل میں ایک کرسی بچھی تھی، اس پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ بوعلی سینا تھا۔

ایک انبوہِ کثیر ایرانی تورانی لوگوں کا دیکھا کہ سب معقول اور خوش وضع لوگ تھے مگر انداز ہر ایک کے جُدا جُدا تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں اجزا اور بعض کی بغل میں کتاب تھی کہ اوراق اُن کے نقش و نگار سے گلزار تھے۔ وہ دعوے کرتے تھے کہ ہم معانی و مضامین کے مُصوّر ہیں۔ ان کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں۔ آخر یہ جواب ملا کہ تم مصور بے شک اچھے ہو مگر بے اصل اور غیر حقیقی اشیا کے مُصوّر ہو۔ تمھاری تصویروں میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ نہیں البتہ انتخاب ہوسکتا ہے۔ یہ لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے۔

چنانچہ انوری، خاقانی، ظہیر فاریابی وغیرہ چند اشخاص منتخب ہو کر اندر آئے، باقی سب نکالے گئے۔

اسی عرصے میں چنگیز خان آیا۔ اس کے لیے گو، علما اور شعرا میں سے کوئی آگے نہ بڑھا بلکہ جب اندر لائے تو خاندانی بادشاہوں نے اسے چشمِ حقارت سے دیکھ کر تبسم کیا۔ البتہ مؤرخوں کے گروہ نے بڑی دھوم دھام کی۔ جب کسی کی زبان سے نسب نامے کا لفظ نکلا تو اس نے فوراً شمشیر جوہردار سند کے طور پر پیش کی جس پر خونی حرفوں سے رقم تھا۔ "سلطنت میں میراث نہیں چلتی"۔ علما نے غل مچایا کہ جس کے کپڑوں سے لہو کی بُو آئے۔ وہ قصاب ہے۔ بادشاہوں میں اس کا کام نہیں۔ شعرا نے کہا کہ جس تصویر کے رنگ میں ہمارے قلم یا مصورانِ تصانیف کی تحریر نے رنگِ بقانہ ڈالا ہو، اسے اس دربار میں نہ آنے دیں گے۔ اس بات پر اس نے بھی تامل کیا اور متاسف معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت ہاتف نے آواز دی کہ اے چنگیز! جس طرح ملک و شمشیر کے جوش کو قوم کے خون میں حرکت دی، اگر علوم و فنون کا بھی خیال کرتا تو آج قومی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اٹھاتا۔ اتنے میں چند مؤرخ آگے بڑھے۔ انھوں نے کچھ ورق دکھائے کہ ان میں طورۂ چنگیز خان یعنی اس کے ملکی انتظام کے قواعد لکھے تھے۔ آخر قرار پایا کہ اسے دربار میں جگہ دو، مگر ان کاغذوں پر کچھ لہو کے چھینٹے دو اور ایک سیاہی کا داغ لگا دو۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک جوان اسی شکوہ و شان کا اور آیا۔ اس کا نام ہلاکو خان تھا۔ اس کے لیے چند علماء نے بھی مورخوں کا ساتھ دیا۔ جس وقت اندر لائے تو اس کے لیے بھی تکراروں کا غل ہوا چاہتا تھا مگر ایک مردِ بزرگ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا۔ جس کی وضع متشرع عالموں کی تھی لیکن کمر میں ایک طرف اصطرلاب، دوسری طرف کچھ اقلیدس کی شکلیں لٹکتی تھیں۔ بغل میں فلسفہ اور حکمت کے چند اجزا تھے۔ ان کا نام محقق طوسی تھا۔ چنانچہ انھیں دیکھ کر کوئی بول نہ سکا۔ اسے تو بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی، محقق کو شیخ بوعلی سینا نے یہ کہہ کہ اپنے پاس بٹھالیا کہ آپ نے میری کلاہِ شہرت میں بقائے دوام کے آبدار موتی ٹانکے، شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے مورخوں نے اس کے لانے کی التجا کی

NOT FOR SALE

مگر وہ سب کو دروازے پر چھوڑ گیا اور اپنا آپ رہبر ہوا کیونکہ وہ خود مؤرخ تھا۔ رستہ جانتا تھا اور اپنا مقام پہچانتا تھا۔ لنگڑاتا ہوا گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسی حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ، آزاد وضع قطع تعلق کا لباس بر میں خاکساری کا عمامہ سر پر آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں۔ تمام علما و صلحا مؤرخ اور شاعر سر جھکائے ان کے ساتھ ہیں۔ وہ دروازے پر آکر ٹھہرے۔ سب نے آگے بڑھنے کو التجا کی تو کہا "معذور رکھو، میرا ایسے مقدموں میں کیا کام ہے" اور فی الحقیقت تو وہ معذور رکھے جاتے، اگر تمام اہل دربار کا شوقِ طلب ان کے انکار پر غالب نہ آتا۔ وہ اندر آئے۔ ایک طلسمات کا شیشہ مینائی ان کے ہاتھ میں تھا کہ اس میں سے کسی کو دودھ، کسی کو شربت، کسی کو شرابِ شیرازی نظر آتی تھی۔ ہر ایک کرسی نشین انھیں اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھ کر کہیں نہ بیٹھے۔ فقط اِس سرے سے اُس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے۔ وہ حافظِ شیراز تھے اور شیشۂ مینائی اُن کا دیوان تھا جو فلکِ مینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے۔

لوگ اور کرسی نشین کے مشتاق تھے، دور سے دیکھا بے شمار لڑکوں کا غول، غل مچاتا چلا آتا ہے۔ بیچ میں ان کے ایک پیر مرد نورانی صورت، جس کی سفید داڑھی میں شگفتہ مزاجی نے کنگھی کی تھی اور خندہ جبینی نے ایک طرہ سر پر آویزاں کیا تھا، اُس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ، دوسرے میں ایک میوہ دار ٹہنی پھلوں پھولوں سے ہری بھری تھی۔ اگر چہ مختلف فرقوں کے لوگ تھے جو باہر استقبال کو کھڑے تھے مگر انھیں دیکھ کر سب نے قدم آگے بڑھائے۔ کیونکہ ایسا کون تھا جو شیخ سعدی اور ان کی "گلستان" اور "بوستان" کو نہ جانتا تھا اور اتنا کہہ کر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے گئے "دنیا دیکھنے کے لیے ہے، برتنے کے لیے نہیں"۔

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک اولوالعزم شخص آیا جس کے چہرے سے خودسری کا رنگ چمکتا تھا اور سینہ زوری کا جوش بازوؤں میں بل مارتا تھا۔ اس کے آنے پر تکرار ہوئی اور مقدمہ یہ تھا کہ اگر علما کی نہیں تو مورخوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہیے ہے بلکہ چغتائی خاندان کے مؤرخ صاف اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔ اُس نے باوجود اس کے ایک کرسی، جس پر تیموری تمغہ بھی تھا۔ گھسیٹ لی اور

NOT FOR SALE

بیٹھ گیا۔ ہمایوں اسے دیکھ کر شرمایا اور سر جھکا لیا۔ اُس نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ میرے دشمن کی اولاد میرے رستے پر قدم بقدم چلیں گے اور فخر کریں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک خورشید کلاہ آیا جس کو انبوہِ کثیر، ایرانی، تورانی اور ہندوستانیوں کے فرقہ ہائے مختلفہ کا بیچ میں لیے آتا تھا۔ وہ جس وقت آیا تو تمام اہلِ دربار کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں اور رضا مندیٔ عام کی ہوا چلی۔ تعجب یہ ہے کہ اکثر مسلمان اس کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ہندو اُسے ہندو جانتے تھے۔ آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا۔ نصاریٰ اس کو نصاریٰ سمجھتے تھے مگر اس کے تاج پر تمام سنسکرت کے حروف لکھے تھے۔

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجا معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود مخمور، نشہ میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی، پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا، اس کے نورِ جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا، اُسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزد کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا، اس لیے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشے سے آنکھ کھلتی تھی تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی۔

شاہجہان بڑے جاہ و جلال سے آیا۔ بہت سے مؤرخ اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لیے تھے اور شاعر اس کے آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ میرِعمارت ان عمارتوں کے فوٹو گراف ہاتھ میں لیے ہوئے تھے جو اس کے نام کے کتابے دکھاتی اور سیکڑوں برس کی راہ تک اس کا نام روشن دکھاتی تھیں۔ اس کے آنے پر رضا مندی عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا مگر ایک جوان آنکھوں سے اندھا، چند بچوں کو ساتھ لیے آیا کہ اپنی آنکھوں کا اور بچوں کے خون کا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ شہر یار، شاہجہان کا چھوٹا بھائی تھا اور بچے اس کے بھتیجے تھے۔

اس وقت وزیر اس کے آگے بڑھا اور کہا کہ جو کیا گیا، بدنیتی اور خود غرضی سے نہیں کیا، بلکہ خلاقِ خُدا

کے امن اور ملک کا انتظام قائم رکھنے کو کیا۔ بہرحال اُسے دربار میں جگہ ملی اور سلاطینِ چغتائیہ کے سلسلے میں معزز درجے پر ممتاز ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد دور سے گانے بجانے کی آواز آئی اور بعد اس کے ایک بادشاہ آیا۔ اس کی وضع ہندوستانی تھی۔ مصنفوں اور مؤرخوں میں سے کوئی اس کے ساتھ نہ تھا۔ البتہ چند اشخاص تھے کہ کوئی ان میں گویا اور کوئی بھانڈ، کوئی مسخرہ نظر آتا تھا۔ یہ سب گھبرائے ہوئے آتے تھے کیونکہ ایک ولایتی دلاور ان کے پیچھے پیچھے شمشیر برہنہ عَلَم کیے تھا۔ اس کی اصفہانی تلوار سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں، مخمل رومی کی کلاہ تھی۔ جس پر ہندوستان کا تاج شاہی نصب تھا اور اسپ بخارائی زیرِ ران تھا۔ وہ ہندوستانی وضع بادشاہ محمد شاہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی سب نے کہا کہ نکالو! نکالو! ان کا یہاں کچھ کام نہیں۔ چنانچہ وہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے۔ ولایتی مذکور نادرشاہ تھا جس نے سرحدِ روم سے بخارا تک فتح کر کے تاجِ ہندوستان سر پر رکھا تھا۔ اسے چنگیز خان کے پاس جگہ مل گئی۔

تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مرقع بغل میں دبائے تھا۔ کوئی گلدستہ ہاتھ میں لیے تھا۔ انھیں دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور وجد کر کے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ ان میں ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا، اس کے منھ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ پھر بھی مشتاق، زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا تھا۔ وہ مرزا رفیع سوداؔ تھے۔

میرؔ بددماغی اور بے پروائی سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ شعر پڑھتے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ دردؔ کی آوازِ دردناک دنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کیے دیتی تھی۔ میرؔحسن اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔ میر انشاء اللہ خاں قدم قدم پر نیا بہروپ دکھاتے تھے۔ دم میں عالم، ذی وقار، متقی و پرہیز گار۔ دم میں ڈاڑھی چٹ، بھنگ کا سونٹا کندھے پر۔

جراَت کو کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا مگر جب وہ میٹھی آواز سے ایک تان اُڑاتا تھا تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے۔ ناسخ کی گلکاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی اور اکثر جگہ قلمکاری اُس کی عینک کی محتاج تھی مگر آتش کی آتش بیانی اُسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومن کم سخن تھے مگر جب کچھ کہتے تھے، جراَت کی طرف دیکھتے تھے۔

ایک پیر مرد دیرینہ سال محمد شاہی دربار کا لباس، جامہ پہنے، کھڑکی دار پگڑی باندھے، جریب ٹیکتے آتے تھے مگر ایک لکھنو کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔ بانکے صاحب ضرور اُن سے دست و گریباں ہو جاتے لیکن چار خاکسار اور پانچواں تاجدار ان کے ساتھ تھا۔ یہ بچا لیتے تھے۔ بڈھے میر امن دہلوی "چار درویش" کے مصنف تھے اور بانکے صاحب میرزا سرور "فسانہ عجائب" والے تھے۔ ذوقؔ کے آنے پر پسندِ عام کے عطر سے دربار مہک گیا۔ انھوں نے اندر آ کر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سودا نے اُٹھ کر ملک الشعرائی کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ غالبؔ اگرچہ سب سے پیچھے تھے، پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے اور بس۔ اتنے میں آواز آئی کہ آزاد کو بلاؤ۔ ساتھ ہی آواز آئی کہ شاید وہ اس جرگے میں بیٹھنا قبول نہ کرے مگر وہاں سے پھر کوئی بولا کہ اسے جن لوگوں میں بٹھا دو گے، بیٹھ جائے گا۔ اتنے میں چند اشخاص نے غُل مچایا کہ اس کے قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ رکھی ہے۔ اسے دربارِ شہرت میں جگہ نہ دینی چاہیے۔ اس مقدمے پر قیل و قال شروع ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ نقاب چہرے سے اُلٹ کر آگے بڑھوں اور کچھ بولوں کہ میرے ہادی ہمدم یعنی فرشتۂ رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا اور چپکے سے کہا کہ ابھی مصلحت نہیں۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ میں اس جھگڑے کو بھی بھول گیا اور خدا کا شکر کیا کہ بلا سے دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی، مُردوں میں سے زندوں تو آیا۔

(نیرنگِ خیال)

مشق

۱۔ درج ذیل جُملے کس شاعر یا ادیب کے بارے میں کہے گئے؟

(الف) کوئی سمجھا کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

(ب) اپنی سحربیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔

(ج) اس کے قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ رکھی ہے۔

(د) لیکن چار خاکسار اور پانچواں فاصلہ تاجداران کے ساتھ تھے۔

(د) ایک لکھنؤ کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔

۲۔ درج ذیل جملے کن بادشاہان یا مشاہیر کے بارے میں ہیں:؟

(الف) جس کے کپڑوں میں لہو کی بُو آئے، وہ قصاب ہے۔

(ب) اِس سرے سے اُس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے۔

(ج) رنگ زرد تھا اور شرم سے سر جھکائے تھا۔

(د) قیافہ روشن اور چہرہ فرحتِ روحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا۔

(ہ) ہندوستان کے بہت سے گراں بہا زیور اس کے ہاتھ میں تھے۔

۳۔ درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

(الف) مصنف نے بقائے دوام کی کتنی قسمیں بتائی ہیں؟ وضاحت کریں۔

(ب) خوبصورت عورتیں درحقیقت کون تھیں؟

(ج) ایرانی شعرا کو دربار میں کیوں نہیں آنے دیا گیا؟

(ڈ) "سلطنت میں میراث نہیں چلتی" سے کیا مراد ہے؟

(ہ) شیخ سعدی کیا کہتے ہوئے باہر چلے گئے؟

۴۔ روزمرہ کے مطابق خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) خواب میں دیکھتا ہوں کہ گویا ہوا ______ چلا جاتا ہوں۔

(ب) خود بخود پچھلی محنتوں کے غبار دل سے ______ جاتے ہیں۔

(ج) اُس نے صلاح دی کہ نقاب ______ پر ڈالو۔

(د) جرأت کو کوئی خاطر میں نہ ______ تھا۔

(ہ) اس کے لیے بھی تکراروں کا غل ہوا ______ تھا۔

۵۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

(الف) دوسری وہ عالمِ یادگار کی بقا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرتِ دوام پاتے ہیں۔

(ب) جس طرح ملک و شمشیر کے جوش کو قوم کے خون میں حرکت دی، اگر علوم و فنون کا بھی خیال کرتا تو آج قومی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اٹھاتا۔

۶۔ درج ذیل الفاظ کو الفبائی ترتیب سے لکھیں اور معنی بھی واضح کریں۔

جاہ و جلال، گروہ کثیر، اولوالعزم، قیل و قال، بلا تامل، عالی وقار۔

* امدادی یا معاون فعل:

امدادی یا معاون فعل وہ ہوتا ہے جو کسی اصل فعل کے ساتھ مل کر مرکب بناتا ہے۔ اس کے معنی میں زور پیدا کرتا ہے اور کام کی تکمیل کو واضح کرتا ہے۔

مثلاً: اس نے سانپ کو مار ڈالا۔ میں نے کتاب پڑھ لی ہے۔

ان جملوں میں ''ڈالا'' اور ''لی'' امدادی فعل ہیں کیونکہ ان دونوں افعال نے معنی میں زیادہ وضاحت اور زور پیدا کیا ہے۔

۷۔ اس سبق میں سے پانچ ایسے جملے لکھیں جن میں امدادی افعال آئے ہیں۔

۸۔ اپنے کسی دلچسپ خواب کا حال بیان کریں۔

ڈاکٹر وزیر آغا

ولادت: ۱۹۲۲ء — وفات: ۲۰۱۰ء

ڈاکٹر وزیر آغا سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وزیر آغا زمانۂ طالب علمی سے محمد دین تاثیر، میرا جی اور ن۔م۔ راشد سے متاثر ہو کر اُردو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے، اُنھوں نے نظم میں نت نئے تجربات سے جدت پیدا کی۔

ادبی جریدے ''اوراق'' کے مدیر رہے۔ یہ جریدہ اپنے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کی وجہ سے ادبی حلقوں میں نہایت تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وزیر آغا اپنے منفرد اور جدید تنقیدی نظریات کی وجہ سے اُردو ادبی دُنیا میں معتبر مانے جاتے ہیں۔ وہ بطور شاعر، نقاد اور صحافی ایک قابلِ قدر مقام رکھتے ہیں لیکن اُن کی ایک اور خصوصیت اُن کی انشائیہ نگاری بھی ہے۔ اچھوتے، نادر اور منفرد موضوعات کی بنا پر وہ انشائیہ نگاری میں ایک اہم نام ہیں۔

تصانیف: اردو ادب میں طنز و مزاح (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی)، اُردو شاعری کا مزاج، گھاس پر تتلیاں، معانی اور تناظر، شام کی منڈیر سے، لکیریں اور دائرے وغیرہ۔

ڈاکٹر وزیر آغا

چند روز ایک روڈ رولر کے ساتھ!

پچھلے چند روز سے میرے گاؤں کی کچی سڑک کو پختہ کرنے کے لیے ایک روڈ رولر آیا ہوا ہے۔ یہ قوی الجثہ، دینو ساری جاپانی پہلوانوں کی طرح کا ایک پہاڑ ہے، مگر گوشت کا پہاڑ نہیں! یہ تو کالے لوہے کا پہاڑ ہے، جس کا کام کچی خوشبودار زمین کے چہرے پر بجری کی تہ جمانا ہے۔ جب یہ ہمارے گاؤں میں داخل ہوا، تو بچّوں اور کتّوں نے اس کا خوب سواگت کیا۔ بچے تو اس کے بھاری بھرکم گول مٹول پہیوں پر سوار ہو کر تالیاں پیٹنے اور شور مچانے لگے۔ البتہ کُتّوں نے صرف بھونکنے تک خود کو محدود رکھا، مگر دو تین روز ہی میں ان لوگوں کا جذبۂ حیرت ماند پڑ گیا اور اب یہ روڈ رولر سارا دن اپنے بوڑھے ڈرائیور کی معیت میں کمال آہستگی کے ساتھ سڑک پر آگے پیچھے ہوتا رہتا ہے۔ شام کو جب ڈرائیور اس پر رکھے ہوئے کمرے کو تالا لگا کر کہیں چلا جاتا ہے، تو میں اس کے پاس آجاتا ہوں اور اس عجوبۂ روزگار کو تا دیر دیکھتا رہتا ہوں۔ سڑک کو

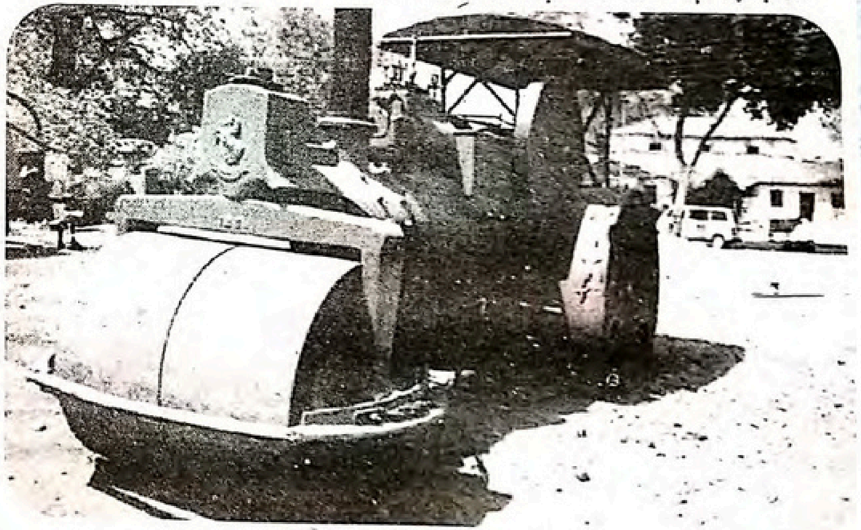

کوٹتے کوٹتے اب اس کے بھاری پہیے خاصے گھِس چکے ہیں۔ اُن پر فِٹ کیا ہوا کمرا بھی خاصا پرانا ہو چکا ہے۔ خدا جانے یہ روڈ رولر اب تک کس کس گھاٹ کا تیل پی چکا ہے کہ اتنا بوڑھا اور گھِسا پٹا نظر آتا ہے؟

پرسوں یہ سوال میں نے اس کے بوڑھے ڈرائیور سے کیا، تو وہ ہنسنے لگا۔ بولا: اس اللہ لوک نے کہاں جانا ہے بابو جی! ساری زندگی اسی علاقے میں دھونی رمائے پڑا رہا ہے۔ مگر جناب! میں نے کئی روڈ رولرز پر کام کیا ہے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہوں۔ بوڑھے ڈرائیور کے یہ الفاظ سن کر مجھے خیال آیا کہ اصل مارکو پولو یا ابنِ بطوطہ تو یہ ڈرائیور ہے جس نے روڈ رولر کی رفتار سے سیاحت کی ہے نہ کہ اسپِ تازی، یا کھڑ کھڑ چلتی گاڑی کی رفتار سے! سو میں نے اس سے کہا کہ کبھی مجھے بھی اپنے ساتھ روڈ رولر پر بیٹھنے کا موقع دو۔ وہ خوش ہو گیا۔ کہنے لگا میں پچھلے پچاس سال سے روڈ رولر چلا رہا ہوں۔ آپ پہلے شخص ہیں، جس نے روڈ رولر پر بیٹھنے کی خواہش کی ہے۔ میں نے کہا کیا کروں، میں خواہش ہی کا تو مارا ہوا ہوں۔ سو پروگرام طے پا گیا۔

دوسرے روز میں روڈ رولر پر سوار ہو گیا۔ یہ کام اتنا ہی مشکل تھا جتنا کسی زمانے میں ہاتھی پر چڑھنا۔ مگر جس طرح آدمی ایک بار ہاتھی کے ہودے میں بیٹھ جائے، تو اس کے دل کی انار کلی کِھل جاتی ہے اور وہ خود کو شہنشاہِ جہانگیر سمجھنے لگتا ہے بالکل اسی طرح جب میں روڈ رولر کے کمرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا، تو مجھے محسوس ہوا کہ میں زندگی کی کسی نئی سطح پر اٹھ آیا ہوں۔ تب ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ روڈ رولر چل پڑا مگر تا دیر میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ چل پڑا ہے یا ابھی رُکا کھڑا ہے۔ یہ سڑک جس پر وہ کام کر رہا ہے نہر کے ساتھ ساتھ بنائی جا رہی ہے۔ میں نے روڈ رولر کی رفتار کا اندازہ لگانے کے لیے ایک نظر نہر کے پانی پر ڈالی۔ پانی کی سطح پر کسی پرندے کا ایک پَر بہتا چلا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ روڈ رولر کے برابر سے گزر اور پھر گزرتا ہی چلا گیا۔ ایک بار پھر مجھے شک پڑا کہ روڈ رولر شاید ابھی چلا نہیں ہے مگر نہیں! وہ تو چل ر تھا، وہ دراصل ٹھہراؤ اور رفتار کے عین درمیان کی حالت میں تھا، یعنی ایک زاویے سے دیکھیں، تو ٹھہرا ہ

نظر آئے، دوسرے زاویے سے دیکھیں، تو حرکت کرتا ہوا۔ مجھے اس سے پہلے ٹھہراؤ اور رفتار کے درمیانی وقفے کا کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اب یہ تجربہ ہوا تو میں کِھل اُٹھا۔

گھنٹہ بھر کے لگاتار سفر میں ہم نے بہ مشکل پچاس گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ روڈ رولر ایک گھنے درخت تک پہنچ گیا اور پھر پورے پندرہ منٹ اس نے درخت کے سائے کو پار کرنے میں لگا دیے۔ چنانچہ مجھے یہ موقع ملا کہ میں درخت کے چھتنار کو بغور دیکھ سکوں۔ میں نے دیکھا کہ درخت کی شاخوں میں پرندے بااطمینان بیٹھے تھے۔ کوئی اور سواری ہوتی مثلاً تانگا، سکوٹر، ٹریکٹر، یا ٹرک، تو وہ ڈر کر اُڑ گئے ہوتے، لیکن روڈ رولر کی آہستہ خرامی نے انھیں قطعاً بے چین نہیں کیا تھا۔ انھی پرندوں میں مجھے ایک بل بتوڑی (چھوٹے الو کی مادہ) اپنے تین نٹ کھٹ نونہالوں کے ساتھ ایک شاخ پر بیٹھی دکھائی دی۔ میں نے دیکھا کہ ماں بیٹے بڑی حیرت سے روڈ رولر کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اتنے حیرت زدہ تھے کہ ان کے گول گول دیدے آنکھوں کے سوراخوں سے باہر نکل آئے تھے۔ تب بل بتوڑی نے ''ہو ہو، ہو ہو'' کی آواز نکالی اور عجیب بات یہ ہے کہ اس بے لفظ بھاشا کا مفہوم فی الفور میری سمجھ میں آنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو، رفتار ہی انتشار ہے!! پرندوں میں الو کو فلاسفر کہا گیا ہے۔ اس روز اگر الو صاحب بھی تشریف فرما ہوتے تو شاید مجھے دانائی کی کسی اور پرت سے بھی آشنا کرتے۔ مگر میں بیگم اُلو کی بات سے بھی خاصا مطمئن تھا۔ ہماری مستورات تو کبھی بھولے سے بھی ایسی دانائی کا مظاہرہ نہ کریں۔

میں نے زندگی بھر ریل میں سفر کیا ہے یا پھر کار میں۔ دونوں سواریاں جب رفتار پکڑتی ہیں، تو ہر شے اُتھل پُتھل ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ان کی رفتار ایک تیز چمکتی ہوئی دو دھاری تلوار کی طرح ہست کے سینے میں اُتر گئی ہے اور ٹھہری ہوئی اشیا زخمی ہو کر تڑپنے لگی ہیں، مگر میں نے ریل یا کار میں سفر کرتے ہوئے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ ریل یا کار تو آگے کو حرکت کرتی ہے، جب کہ وہ اشیا، جنھیں یہ ٹھوکر لگا کر کچی نیند سے بیدار کرتی ہے ایک عملِ معکوس کا مظاہرہ کرتی ہوئی پیچھے کی طرف اٹھ بھاگتی ہیں.......... درخت، ٹیلے، مکان، فیکٹری، پُل، دریا اور نہریں، یہ سب ریل یا کار کی الٹی سمت اتنی تیز رفتاری سے بھاگتی ہیں کہ انسان

سوچتا ہے شاید یہ گھر پر کوئی قیمتی شے بھول آئی ہیں اور اب جلد از جلد واپس جا کر اسے اپنی تحویل میں لینا چاہتی ہیں۔ تیز رفتار سواری پورے ماحول ہی کو لرزہ براندام نہیں کرتی، اسے ایک مسلسل تبدیلی سے ہم کنار بھی کر دیتی ہے۔ آپ کسی شے پر بھی نظریں جما نہیں پاتے، ابھی جو شے نظر کی گرفت میں آئی تھی وہ اب کہاں ہے؟ ......نہر کنارے کپڑے دھوتی ہوئی دیہاتی دوشیزہ، مکان کی چھت سے سڑک کو بے معنی نظروں سے دیکھتی ہوئی ایک بوڑھی عورت، چارپائی پر دراز ایک شخص اور چارپائی کو اٹھائے ہوئے دو آدمی، اونٹوں کی ایک لمبی قطار اور اونٹوں پر بیٹھے ہوئے سرخ و سپید بچے.......... کسی شے کو بھی بقا نہیں۔ ہر شے ایک لمحے کے لیے سکرین پر آتی ہے اور پھر غائب! انسان سوچتا ہے کہ واقعی تغیر کو ثبات ہے اور یہ زندگی اور کائنات کوئی ٹھوس بنیاد نہیں رکھتی۔ یہ تو محض آنے جانے کا ایک سلسلہ ہے۔

مگر روڈ رولر پر بیٹھتے ہی ایک بالکل نئے بُعد کا احساس ہوتا ہے۔ روڈ رولر اردگرد کی دنیا کو جگاتا تو ہے، مگر اُسے ہڑبڑا کر اٹھ بھاگنے پر مائل بالکل نہیں کرتا۔ یہی شاید اس کا اصل کمال ہے۔ دنیا اگر سوئی رہے تو سمجھو یہ ایک مردہ شے ہے، پتھر کی ایک سِل ہے، مگر جب یہ سِل ٹھوکر لگتے ہی اپنی آنکھیں آہستگی سے کھول دے اور پھر میٹھی نظروں سے چاروں اور دیکھنے لگے تو سمجھو اب یہ ہست کا بے جان پھیلاؤ نہیں رہی بلکہ موجودگی، کی ایک کھنکتی ہوئی قاش بن چکی ہے۔ بس یہی اصل بات ہے اور اس روز روڈ رولر پر بیٹھتے ہی مجھے موجودگی، سے پہلی بار جو تعارف حاصل ہوا وہ اسی نوعیت کا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے سامنے کی پہاڑیاں، نہر، درخت، پرندے اور کھیت جو نہ جانے کب سے رُکے کھڑے تھے، یکایک اپنے ہونے، اپنی موجودگی کا اعلان کرنے لگے ہیں۔ آج سے پہلے میں اکثر سوچتا کہ اگر رفتار کم سے کم کی جاسکے، تو ہست کے لباس کی بُنت میں جگہ جگہ سوراخ اور جھرّیاں نمودار ہو جائیں گی، جن میں سے ابدیت کی روشنی چھن چھن کر نکلنے لگے گی اور میں اس نور میں پوری طرح بھیگ جاؤں گا (مراقبے یا سمادھی میں ڈوب جانے والے اپنی رفتار کو کم سے کم سطح پر لا کر شاید اسی سہانی کیفیت سے متعارف ہونے کے متمنی ہیں) مگر آج مجھے یوں لگا ہے جیسے موجودگی، ہست کے رُکے ہوئے بے جان وجود کا نام نہیں ہے اور نہ یہ ہست کے مرقد پر چڑھا ہوا ریشم کا

ایک مہین غلاف ہے بلکہ بجائے خود ایک پوری طرح گندھی ہوئی، ایک بھرپور شے ہے، جس کی ایک اپنی شخصیت، اپنا کردار اور اپنی رفتار ہے۔

مجھے روڈ رولر پر سفر کرتے ہوئے اب تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے، سو میں نے ڈرائیور سے کہا: کہ بابا جی! اب مجھے اتار دیں۔ میں واپس گھر جانا چاہتا ہوں۔ ڈرائیور نے کہا۔ کوئی بات نہیں میں روڈ رولر پر آپ کو گھر چھوڑ آتا ہوں، مگر میں نے کہا: شکریہ مجھے ذرا جلدی گھر پہنچنا ہے۔ سو میں روڈ رولر سے اُتر کر تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ مگر اب میں ایک اور ہی شخص تھا۔ اب میرے لیے روڈ رولر "ہست" کا ایک انگ نہیں تھا بلکہ بجائے خود ایک خود مختار، سدابہار، دھڑکتی اور سانس لیتی ہوئی "موجودگی" کا مظہر تھا۔ تب میں سوچنے لگا کہ ہر خواہش کے اندر ایک خلا ہوتا ہے، جسے وہ باہر کے وجود سے بھر لینا چاہتی ہے اور جب اسے بھر لیتی ہے، تو اس کا سانس رک جاتا ہے اور وہ مرجاتی ہے، مگر روڈ رولر تو اندر سے خالی نہیں ہے۔ یہ تو ایک گٹھا ہوا، ٹھوس، ہر اعتبار سے ایک بھرپور وجود ہے۔ پھر اسے "باہر" کی کسی شے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ .... یہ ایک عجیب سا احساس تھا اور پھر یکا یک میرے سینے کا خلا غبارے کی طرح پھول کر ایک ہمکتی ہوئی خواہش میں تبدیل ہوگیا اور میں سوچنے لگا کہ کاش! میں بھی ایک روڈ رولر ہوتا!

(پگڈنڈی سے روڈ رولر تک)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں:

(الف) روڈ رولر کی شکل وصورت کیسی تھی؟

(ب) روڈ رولر کس رفتار سے چل رہا تھا؟

(ج) مغرب میں اُلّو کو کس چیز کی علامت سمجھا جاتا ہے؟

(د) مصنف نے روڈ رولر پر کتنی دیر سفر کیا؟

(ہ) مصنف نے روڈ رولر کی رفتار پر کن خیالات کا اظہار کیا؟

۲۔ خالی جگہ پُر کریں:

(الف) کتوں نے ___بھونک___ کر روڈ رولر کا استقبال کیا۔

(ب) بلکہ ___موجودگی___ کی ایک کھنکتی ہوئی قاش بن گئی۔

(ج) ہر خواہش کے اندر ایک ___خلا___ ہوتا ہے۔

(د) یہ چیزیں ___عمل معکوس___ کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیچھے بھاگتی ہیں۔

۳۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

(الف) رفتار ہی انتشار ہے۔

(ب) واقعی تغیر کو ثبات ہے۔

(ج) میں نے کہا شکریہ! مجھے ذرا جلدی گھر پہنچنا ہے۔

۴۔ درج ذیل جملوں کو قواعد کے مطابق درست کریں۔

(الف) بوڑھا شخص بہت سے گھاٹوں کا پانی پی چکا تھا۔

(ب) پاکستان کے اندر افرادی قوت کی کمی نہیں ہے۔

(ج) میں نے اپنے کالج کی لائبریری سے استفادہ حاصل کیا۔

(د) لڑکا ڈرتا ڈرتا پرنسپل کے دفتر میں داخل ہوا۔

(ہ) ملتان اولیاؤں کی سرزمین ہے۔

۵۔ درج ذیل جملوں میں مناسب مقامات پر رموزِ اوقاف لگائیں۔

الف) وہ بازار سے سبزیاں پھل دالیں اور گوشت لایا۔

ب) وہ شخص خوشبو کی طرح آیا جھوما خوشیاں بکھیریں اور چلا گیا۔

ج) قائداعظم بانئ پاکستان بہت بڑے سیاست دان تھے۔

د) ہم مجبور انسان اِن حالات کا مقابلہ کیسے کریں۔

ہ) تم اچھے ہو یا بُرے عالم ہو یا جاہل دین دار ہو یا دُنیا دار اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہو۔

سعادت حسن منٹو

ولادت: ۱۹۱۲ء

وفات: ۱۹۵۵ء

سعادت حسن منٹو موضع سمبرالا (لدھیانہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ غلام حسن تھا۔ منٹو کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ منٹو کا تعلیمی ریکارڈ کچھ زیادہ اچھا نہ تھا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اُردو میں اکثر فیل ہوتے تھے۔ منٹو کو زمانہ طالب علمی سے ہی ادب سے دلچسپی تھی۔ اُنھوں نے ادبی زندگی کا آغاز غیر ملکی کہانیوں کے تراجم سے کیا لیکن جلد ہی وہ تخلیقی کہانیاں لکھنے لگے۔ اس کے علاوہ ریڈیو اور فلموں کے لیے کہانیاں لکھ کر پیسے کماتے رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ بمبئی سے لاہور منتقل ہوگئے۔ منٹو کی آخری عمر بڑی کسمپرسی کی حالت میں گزری۔

منٹو اُردو ادب کا ایک اہم اور متنازعہ افسانہ نگار ہے۔ نقاد اُنھیں ترقی پسند کہتے ہیں لیکن ترقی پسند اُنھیں قبول کرنے سے انکاری ہیں۔ وہ انسانی زندگی اور اس کی نفسیات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اُنھوں نے کھردری حقیقت کو بے رحمی سے موضوع بنایا اور قارئین کو چونکایا۔ وہ ایک حساس طبع اور باریک مشاہدے کا فنکار تھا۔ منٹو کی تصانیف اور تخلیقات مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں۔

تصانیف: آتش پارے، منٹو کے افسانے، دھواں، لذتِ سنگ، چغد، ٹھنڈا گوشت، یزید، نمرود کی خُدائی، بادشاہت کا خاتمہ وغیرہ۔

منظور

جب اسے ہسپتال میں داخل کیا گیا تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ پہلی رات اسے آکسیجن پر رکھا گیا۔ جو نرس ڈیوٹی پر تھی، اس کا خیال تھا کہ یہ نیا مریض صبح سے پہلے پہلے مرجائے گا۔ اس کی نبض کی رفتار غیر یقینی تھی۔ کبھی زور زور سے پھڑ پھڑاتی اور کبھی لمبے لمبے وقفوں کے بعد چلتی تھی۔

پسینے میں اس کا بدن شرابور تھا، ایک لحظے کے لیے بھی اسے چین نہیں ملتا تھا۔ کبھی اس کروٹ لیٹتا، کبھی اس کروٹ۔ جب گھبراہٹ بہت زیادہ بڑھ جاتی تو اٹھ کر بیٹھ جاتا اور لمبے لمبے سانس لینے لگتا۔ رنگ اس کا ہلدی کی گانٹھ کی طرح زرد تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں۔ ناک کا بانسا برف کی ڈلی۔ سارے بدن پر رعشہ تھا۔

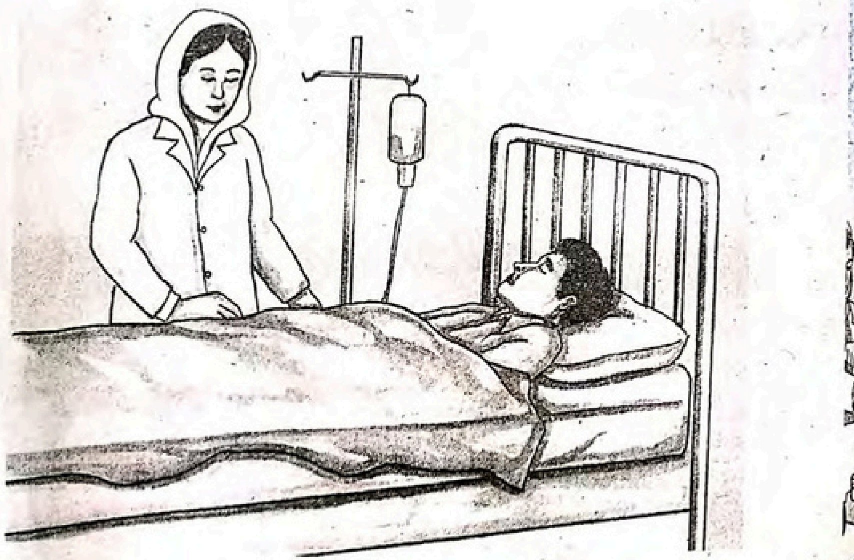

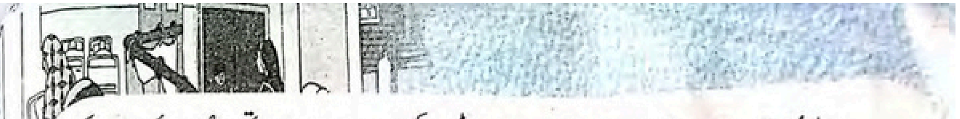

ساری رات اس نے بڑے شدید کرب میں کاٹی۔ اوکسیجن برابر دی جارہی تھی، صبح ہوئی تو اسے کسی قدر افاقہ ہوا اور وہ نڈھال ہوکر سوگیا۔

اس کے دو تین عزیز آئے۔ کچھ دیر بیٹھے رہے اور چلے گئے۔ ڈاکٹروں نے انہیں بتا دیا تھا کہ مریض کو دل کا عارضہ ہے جسے ''کورونری تھرومبوسس'' کہتے ہیں۔ یہ بہت مہلک ہوتا ہے۔

جب وہ اٹھا تو اسے ٹیکے لگا دیئے گئے۔ اس کے دل میں بدستور میٹھا میٹھا درد ہورہا تھا۔ شانوں کے پٹھے اکڑے ہوئے تھے۔ جیسے رات بھر انہیں کوئی کوٹتا رہا تھا۔ جسم کی بوٹی بوٹی دکھ رہی تھی مگر نقاہت کے باعث وہ بہت زیادہ تکلیف محسوس نہیں کررہا تھا۔ ویسے اس کو یقین تھا کہ اس کی موت دور نہیں، آج نہیں تو کل ضرور مرجائے گا۔

اس کی عمر بتیس برس کے قریب تھی۔ ان برسوں میں اس نے کوئی راحت نہیں دیکھی تھی جو اس وقت اسے یاد آتی اور اس کی صعوبت میں اضافہ کرتی۔ اس کے ماں باپ اس کو بچپن ہی سے داغ مفارقت دے گئے تھے۔ معلوم نہیں اس کی پرورش کس خاص شخص نے کی تھی۔ بس وہ ایسے ہی ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھاتا، اس عمر تک پہنچ گیا تھا اور ایک کارخانے میں ملازم ہوکر پچیس روپے ماہوار پر انتہا درجے کی افلاس زدہ زندگی گزار رہا تھا۔

دل میں ٹیسیں نہ اٹھتیں تو وہ اپنی تندرستی اور بیماری میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہ کرتا کیونکہ صحت اس کی کبھی بھی اچھی نہیں تھی۔ کوئی نہ کوئی عارضہ اسے ضرور لاحق رہتا تھا۔

شام تک اسے چار ٹیکے لگ چکے تھے۔ اوکسیجن ہٹالی گئی تھی۔ دل کا درد کسی قدر کم تھا، اس لیے وہ ہوش میں تھا اور اپنے گردوپیش کا جائزہ لے سکتا تھا۔

وہ بہت بڑے وارڈ میں تھا جس میں اس کی طرح اور کئی مریض لوہے کی چارپائیوں پر لیٹے تھے سیں اپنے کام میں مشغول تھیں۔ اس کے داہنے ہاتھ نو دس برس کا لڑکا کمبل میں لپٹا ہوا اس کی طرف دیکھ ا تھا، اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

NOT FOR SALE

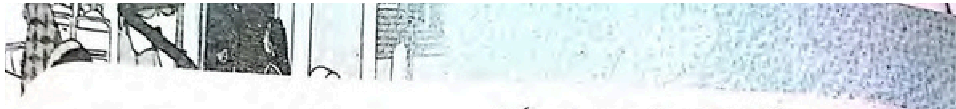

''السلام علیکم''۔ لڑکے نے بڑے پیار سے کہا۔

''وعلیکم السلام''۔ لڑکے نے نئے مریض نے اس کے پیار بھرے لہجے سے متاثر ہوکر جواب دیا۔ کمبل میں کروٹ بدلی: بھائی جان! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے''۔ نئے مریض نے اختصار سے کہا: اللہ کا شکر ہے۔

لڑکے کا چہرہ اور زیادہ تمتما اٹھا۔ ''آپ بہت جلدی ٹھیک ہوجائیں گے۔ آپ کا نام کیا ہے''۔

''میرا نام''! نئے مریض نے مسکرا کر لڑکے کی طرف برادرانہ شفقت سے دیکھا۔

''میرا نام اختر ہے''۔

''میرا نام منظور ہے''۔ یہ کہہ کر اس نے یک دم کروٹ بدلی اور اس نرس کو پکارا جو ادھر سے گزر رہی تھی۔

''آپا.................. آپا جان''۔

نرس رک گئی۔ منظور نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سلام کیا۔ نرس قریب آئی اور اسے پیار کرکے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اسسٹنٹ ہاؤس سرجن آیا۔ منظور نے اس کو بھی سلام کیا۔ ''ڈاکٹر جی، السلام علیکم''۔

ڈاکٹر سلام کا جواب دے کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور دیر تک اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے باتیں کرتا رہا جو ہسپتال کے بارے میں تھیں۔

منظور کو اپنے وارڈ کے ہر مریض سے دلچسپی تھی۔ اس کو معلوم تھا کس کی حالت اچھی ہے اور کس کی حالت خراب ہے، کون گیا ہے سب نرسیں اس کی بہنیں تھیں اور سب ڈاکٹر اس کے دوست۔ مریضوں میں کوئی چچا تھا، کوئی ماموں اور کوئی بھائی۔

سب اس سے پیار کرتے تھے۔ اس کی شکل وصورت معمولی تھی۔ مگر اس میں غیر معمولی کشش تھی۔ ہر وقت اس کے چہرے پر تمتماہٹ رہتی جو اس کی معصومیت پر ہالے کا کام دیتی تھی۔ وہ ہر وقت خوش رہتا تھا۔ بہت زیادہ باتونی تھا، مگر اختر کو، حالانکہ وہ دل کا مریض تھا اور اس مرض کے باعث بہت چڑ چڑا ہوگیا

NOT FOR SALE

تھا، اس کی یہ عادت کھلتی نہیں تھی۔

چونکہ اس کا بستر اختر کے بستر کے پاس تھا، اس لیے وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اس سے گفتگو شروع کر دیتا تھا جو چھوٹے چھوٹے معصوم جملوں پر مشتمل ہوتی تھی۔

''بھائی جان! آپ کے بھائی بہن ہیں؟''

''میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا لڑکا ہوں''۔

''آپ کے دل میں اب درد تو نہیں ہوتا ہے''۔

''آپ ٹھیک ہو جائیں گے.........دودھ زیادہ پیا کریں!''

''میں بڑے ڈاکٹر جی سے کہوں گا، وہ آپ کو مکھن بھی دیا کریں گے''۔

بڑا ڈاکٹر بھی اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ صبح جب راؤنڈ پر آتا تو کرسی منگا کر اس کے پاس تھوڑی دیر تک ضرور بیٹھتا اور اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا۔

اس کا باپ درزی تھا۔ دوپہر کو پندرہ بیس منٹ کے لیے آتا۔ سخت افراتفری کے عالم میں اس کے لیے پھل وغیرہ لاتا اور جلدی جلدی اسے کھلا کر اور اس کے سر پر محبت کا ہاتھ پھیر کر چلا جاتا۔ شام کو اس کی ماں آتی اور برقع اوڑھے دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہتی۔

اختر نے اسی وقت اس سے دلی رشتہ قائم کر لیا تھا، جب اس کو سلام کیا تھا۔ اس سے باتیں کرنے کے بعد یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ دوسرے دن رات کی خاموشی میں جب اسے سوچنے کا موقع ملا تو اس نے محسوس کیا۔ اس کو جو افاقہ ہوا ہے، منظور ہی کا معجزہ ہے۔

ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ وہ صرف چند گھڑیوں کا مہمان تھا۔ منظور نے اس کو بتایا تھا کہ جب اسے بستر پر لٹایا گیا تھا تو اس کی نبض قریب قریب غائب تھی۔ اس نے دل ہی دل میں کئی مرتبہ دعا مانگی تھی کہ خدا اس پر رحم کرے۔ یہ اس کی دعا ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ مرتے مرتے بچ گیا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہے گا، اس لیے کہ اس کا مرض بہت مہلک تھا۔ بہرحال اب اس کے دل میں اتنی

خواہش ضرور پیدا ہو گئی تھی کہ وہ کچھ دن زندہ رہے تاکہ منظور سے اس کا رشتہ فوراً نہ ٹوٹ جائے۔

دو تین دن گزر گئے۔ منظور حسبِ معمول سارا دن چہکتا رہتا تھا۔ کبھی نرسوں سے باتیں کرتا کبھی ڈاکٹروں سے، کبھی جمعداروں سے۔ یہ بھی اس کے دوست تھے۔ اختر کو تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وارڈ کی بدبودار فضا کا ہر ذرہ اس کا دوست ہے۔ وہ جس شے کی طرف دیکھتا تھا، فوراً اس کی دوست بن جاتی تھی۔

دو تین روز گزرنے کے بعد جب اختر کو معلوم ہوا کہ منظور کا نچلا دھڑ مفلوج ہے تو اسے سخت صدمہ پہنچا۔ لیکن اس کو حیرت بھی ہوئی کہ اتنے بڑے نقصان کے باوجود وہ خوش کیونکر رہتا ہے۔ باتیں جب اس کے منہ سے بلبلوں کی مانند نکلتی تھیں تو انہیں سن کر کون کہہ سکتا تھا کہ اس کا نچلا دھڑ گوشت پوست کا بے جان لوتھڑا ہے۔

اختر نے اس سے اس کے فالج کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ اس لیے کہ اس سے ایسی بات کے متعلق پوچھنا بہت بڑی حماقت ہوتی جس سے وہ قطعاً بے خبر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اسے کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا کہ منظور ایک دن جب کھیل کود کو واپس آیا تو اس نے ٹھنڈے پانی سے نہا لیا جس کے باعث ایک دم اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا۔

ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا، انہیں بہت دکھ ہوا۔ شروع شروع میں حکیموں سے علاج کرایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر ٹونے ٹوٹکوں کا سہارا لیا مگر بے سود۔ آخر کسی کے کہنے پر اُنھوں نے اسے ہسپتال میں داخل کر دیا تاکہ باقاعدگی سے اس کا علاج ہوتا رہے۔

ڈاکٹر مایوس تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس کے جسم کا مفلوج حصہ کبھی درست نہ ہوگا مگر پھر بھی اس کے والدین کا جی رکھنے کے لیے وہ اس کا علاج کر رہے تھے۔ انہیں حیرت تھی کہ وہ اتنی دیر زندہ کیسے رہا ہے۔ اس لیے کہ اس پر فالج کا حملہ بہت شدید تھا، جس نے اس کے جسم کا نچلا حصہ بالکل ناکارہ کرنے کے سوا اس کے بدن کے بہت سے نازک اعضا جھنجھوڑ کر رکھ دیے تھے۔ وہ اس پر ترس کھاتے تھے اور اسے پیار کرتے تھے۔ اس لیے کہ اس نے سدا خوش رہنے کا گُر اپنی اس شدید علالت سے سیکھا تھا۔ اس کے معصوم

ماغ نے یہ طریقہ خود ایجاد کیا تھا کہ اس کا دکھ دب جائے۔

اختر پر پھر ایک دورہ پڑا۔ یہ پہلے دورے سے کہیں زیادہ تکلیف دہ اور خطرناک تھا مگر اس نے صبر اور تحمل سے کام لیا اور منظور کی مثال سامنے رکھ کر اپنے درد سے غافل رہنے کی کوشش کی جس میں اسے کامیابی ہوئی۔ ڈاکٹروں کو اس مرتبہ تو سو فیصد یقین تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی، مگر معجزہ رونما ہوا اور رات کی ڈیوٹی پر مُعین نرس نے صبح سویرے اسے دوسری نرسوں کے سپرد کیا تو اس کی گرتی ہوئی نبض سنبھل چکی تھی..........وہ زندہ تھا۔

موت سے کشتی لڑتے لڑتے نڈھال ہو کر جب وہ سونے لگا تو اس نے نیم مُندی ہوئی آنکھوں سے منظور کی طرف دیکھا جو محوِ خواب تھا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اختر نے اپنے کمزور ونحیف دل میں اس کی پیشانی کو چوما اور سو گیا۔

جب اٹھا تو منظور چہک رہا تھا۔ اس کے متعلق ایک نرس سے کہہ رہا تھا۔ ''آپا اختر بھائی جان کو جگاؤ۔ دوا کا وقت ہو گیا ہے''۔

''سونے دو..................اسے آرام کی ضرورت ہے''۔

''نہیں..................وہ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ انہیں دوا دیجیے''۔

''اچھا دے دوں گی''۔

منظور نے جب اختر کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے بہت خوش ہو کر بآوازِ بلند کہا:

''السلام علیکم''۔

اختر نے نقاہت بھرے لہجے میں جواب دیا: ''وعلیکم السلام''۔

''بھائی جان! آپ بہت سوئے''۔

''ہاں..................شاید''۔

''نرس آپ کے لیے دوا لا رہی ہے''۔

اختر نے محسوس کیا کہ منظور کی باتیں اس کے نحیف دل کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ خود اسی کی طرح چہکنے چہکارنے لگا۔ اس نے منظور سے پوچھا: ''اس مرتبہ بھی تم نے میرے لیے دعا مانگی تھی''؟

منظور نے جواب دیا۔ ''نہیں''۔

''کیوں؟''

''میں روز روز دعائیں نہیں مانگا کرتا..........ایک دفعہ مانگ لی، کافی تھی۔ مجھے معلوم تھا آپ ٹھیک ہو جائیں گے''۔ اس کے لہجے میں یقین تھا۔

اختر نے اسے ذرا سا چھیڑنے کے لیے کہا؛ ''تم دوسروں سے کہتے رہتے ہو کہ ٹھیک ہو جاؤ گے، خود کیوں نہیں ٹھیک ہو کر گھر چلے جاتے''۔

منظور نے تھوڑی دیر سوچا ''میں بھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ بڑے ڈاکٹر جی کہتے تھے کہ تم ایک مہینے تک چلنے پھرنے لگو گے..........دیکھیں نا اب میں نیچے اور اوپر کھسک سکتا ہوں''۔

اس نے کمبل میں اوپر نیچے کھسکنے کی ناکام کوشش کی۔ اختر نے فوراً کہا: واہ منظور میاں واہ.......... ایک مہینا کیا ہے.......... یوں گزر جائے گا۔

منظور نے چٹکی بجائی اور خوش ہو کر ہنسنے لگا۔

ایک مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ اس دوران اختر پر دل کے دو تین دورے پڑے جو زیادہ شدید نہیں تھے۔ اب اس کی حالت بہتر تھی، نقاہت دور ہو رہی تھی۔ اعصاب میں پہلا سا تناؤ بھی نہیں تھا۔ دل کی رفتار ٹھیک تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اب وہ خطرے سے باہر ہے۔ لیکن ان کا تعجب بدستور قائم تھا کہ وہ بچ کیسے گیا۔

اختر دل ہی دل میں ہنستا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے بچانے والا کون ہے۔ وہ کوئی انجکشن نہیں تھا۔

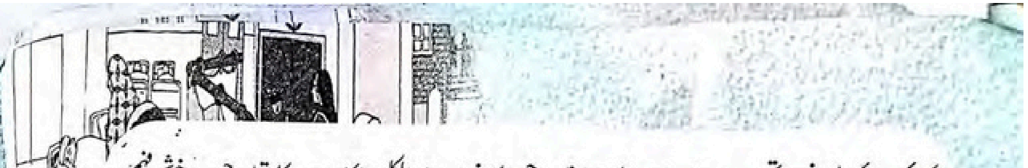

کوئی دوائی ایسی نہیں تھی۔ وہ منظور تھا، مفلوج منظور، جس کا نچلا دھڑ بالکل ناکارہ ہو چکا تھا، جسے یہ خوش فہمی تھی کہ اس کے گوشت پوست کے بے جان لوتھڑے میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔

اختر اور منظور کی دوستی بہت بڑھ گئی تھی۔ منظور کی ذات اس کی نظروں میں مسیحا کا رتبہ رکھتی تھی کہ اس نے اس کو دوبارہ زندگی عطا کی تھی اور اس کے دل و دماغ سے وہ تمام کالے بادل ہٹا دیئے تھے۔ جن کے سائے میں وہ اتنی دیر تک گھٹی گھٹی زندگی بسر کرتا رہا تھا۔ اس کی قنوطیت، رجائیت میں تبدیل ہوگئی تھی، اسے زندہ رہنے سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بالکل ٹھیک ہو کر ہسپتال سے نکلے اور ایک صحت مند زندگی بسر کرنی شروع کردے۔

اسے بڑی الجھن ہوتی تھی جب وہ دیکھتا تھا کہ منظور ویسے کا ویسا ہے۔ اس کے جسم کے مفلوج حصے پر ہر روز مالش ہوتی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا تھا، اس کی خوش رہنے والی طبیعت شگفتہ سے شگفتہ تر ہو رہی تھی۔ یہ بات حیرت اور الجھن کا باعث تھی۔

ایک دن بڑے ڈاکٹر نے منظور کے باپ سے کہا کہ اب وہ اسے گھر لے جائے کیونکہ اس کا علاج نہیں ہوسکتا۔

منظور کو صرف اتنا پتہ چلا کہ اب اس کا علاج ہسپتال کے بجائے گھر پر ہوگا اور بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر اسے سخت صدمہ پہنچا۔ وہ گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اختر نے جب اس سے پوچھا کہ وہ ہسپتال میں کیوں رہنا چاہتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”وہاں اکیلا رہوں گا۔ ابا دکان پر جاتا ہے، ماں ہمسائی کے ہاں جا کر کپڑے سیتی ہے، میں وہاں کس سے کھیلا کروں گا، کس سے باتیں کروں گا“؟

اختر نے بڑے پیار سے کہا: ”تم اچھے جو ہو جاؤ گے منظور میاں۔ چند دن کی بات ہے پھر تم باہر اپنے دوستوں سے کھیلا کرنا۔ اسکول جایا کرنا“۔

”نہیں نہیں۔“ منظور نے کمبل سے اپنا سدا تمتمانے والا چہرہ ڈھانپ کر رونا شروع کردیا۔ اختر کو بہت دکھ ہوا۔ دیر تک وہ اسے چمکارتا پچکارتا رہا۔

NOT FOR SALE

آخر اس کی آواز گلے میں رندھ گئی اور اس نے کروٹ بدل لی۔

شام کو ہاؤس سرجن نے اختر کو بتایا کہ بڑے ڈاکٹر صاحب نے اس کی ریلیز کا آرڈر دے دیا ہے۔ وہ صبح جاسکتا ہے۔ منظور نے سنا تو بہت خوش ہوا۔

اس نے اتنی باتیں کین، اتنی باتیں کیں کہ تھک گیا۔ ہر نرس کو، ہر اسٹوڈنٹ کو، ہر جمعدار کو اس نے بتایا کہ بھائی جان اختر جا رہے ہیں۔

رات کو بھی وہ اختر سے دیر تک خوشی سے بھرپور ننھی ننھی معصوم باتیں کرتا رہا۔ آخر سو گیا۔ اختر جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ منظور کب تک ٹھیک ہوگا۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی دوا موجود نہیں جو اس پیارے سے بچے کو تندرست کردے۔ اس نے اس کی صحت کے لیے صدقِ دل سے دعائیں مانگیں مگر اسے یقین تھا کہ یہ قبول نہیں ہوں گی، اس لیے کہ اس کا دل منظور کا سا پاک دل کیسے ہوسکتا ہے۔

منظور اور اس کی جدائی کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے بہت دکھ ہوتا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ صبح اس کو وہ چھوڑ کر چلا جائے گا اور اپنی نئی زندگی تعمیر کرنے میں مصروف ہو کر اسے اپنے دل و دماغ سے محو کردے گا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ منظور کی ”السلام علیکم“ سننے سے پہلے ہی مرجاتا۔ یہ نئی زندگی جو اس کی عطا کردہ تھی، وہ کس منہ سے اٹھا کر ہسپتال سے باہر لے جائے گا۔

سوچتے سوچتے اختر سو گیا۔ صبح دیر سے اٹھا۔ نرسیں وارڈ میں ادھر ادھر تیزی سے چل پھر رہی تھیں۔ کروٹ بدل کر اس نے منظور کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ اس پر اس کی بجائے ایک بوڑھا، ہڈیوں کا ڈھانچہ لیٹا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اختر پر سناٹا طاری ہوگیا۔ ایک نرس پاس سے گزر رہی تھی، اس سے اس نے قریب قریب چلّا کر پوچھا: ”منظور کہاں ہے“؟

نرس رکی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے بڑے افسوسناک لہجے میں جواب دیا۔ ”بے چارہ! صبح ساڑھے پانچ بجے مرگیا“۔

یہ سن کر اختر کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے سمجھا کہ یہ آخری دورہ ہے......

NOT FOR SALE

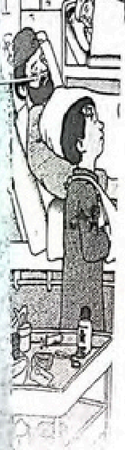

مگر اُس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی اُسے ہسپتال سے رخصت ہونا پڑا۔

(منٹو کے بہترین افسانے)

مشق

۱۔ خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) اُس کے دل کی رفتار ______ تھی۔

(ب) مریض کو دل کا عارضہ ہے جسے ______ کہتے ہیں۔

(ج) وہ ہوش میں تھا اور اپنے ______ کا جائزہ لے سکتا تھا۔

(د) اُس نے ______ ہوئی آنکھوں سے منظور کی طرف دیکھا۔

(ہ) منظور کی ذات اُس کی نظر میں ______ کا درجہ رکھتی تھی۔

۲۔ درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

(الف) اختر کو کس حالت میں ہسپتال لایا گیا؟

(ب) منظور کی بیماری کی وجہ کیا تھی؟

(ج) منظور ہسپتال سے گھر کیوں نہیں جانا چاہتا تھا؟

(د) اختر کے خیال میں اُس کے صحت مند ہونے کی کیا وجہ تھی؟

(ہ) ہسپتال کے اہلکاروں کا منظور سے کیسا رویّہ تھا؟

۳۔ منظور کے کردار پر ایک پیراگراف لکھیں۔

۴۔ اس افسانے کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۵۔ اس افسانے سے کم از کم ایسے پانچ جملوں کا انتخاب کریں جن میں امدادی افعال کا استعمال ہو۔

۶۔ اعراب لگائیں:

مفلوج، معجزہ، معین، مسیحا، مریض، مرض، مانند۔

۷۔ سرکاری ہسپتال میں داخل کسی مریض کی آپ بیتی لکھیں۔

۸۔ درج ذیل پیراگراف میں مناسب مقامات پر رموزِ اوقاف لگائیں۔

دورِ حاضر میں بجلی ایک خادمہ کی حیثیت رکھتی ہے گھروں کارخانوں اور دفتروں میں ہر جگہ یہ ہماری روزمرّہ زندگی کا لازمہ ہے بٹن دبایا پنکھا چل پڑا روشنی ہوگئی ہیٹر جل اُٹھا ائیر کنڈیشن نے کمرہ ٹھنڈا کر دیا ریفریجریٹر میں ہر چیز یخ بستہ ہوگئی کھانا تیار ہے کپڑے دُھل گئے استری ہوگئی لفٹ نے آپ کو سیکڑوں فُٹ بلندی پر پہنچا دیا غرض سوئچ دباتے ہی سب کچھ آن کی آن میں ہو جاتا ہے

۹۔ سبق کے مطابق جو جملے درست ہیں ان کے سامنے (✓) اور جو غلط ہیں ان کے سامنے (✗) کا نشان لگائیں۔

۱۔ اختر کے بدن پر رعشہ طاری تھا۔

ب۔ اختر اور منظور ہم عمر تھے۔

ج۔ اختر کی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول کی۔

د۔ منظور صحت یاب ہو کر گھر چلا گیا۔

ہ۔ کامیاب علاج نے ہی اختر کی بیماری ختم کی۔

و۔ منظور کی چارپائی پر ایک نحیف ونزار بوڑھا پڑا تھا۔

۱۰۔ تقریباً چار سو الفاظ پر مشتمل افسانہ لکھیں جس کا عنوان ایثار و قربانی ہو۔

غلام عباس

ولادت: ۱۹۰۹ء

وفات: ۱۹۸۲ء

غلام عباس امرتسر کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دیال سنگھ ہائی سکول لاہور . حاصل کی اور لاہور سے ہی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ مختلف رسائل کے مُدیر رہے۔ پھر محکمۂ تعلقات . سے منسلک ہوئے، کچھ عرصے بعد بی بی سی سے وابستہ ہوکر لندن چلے گئے۔ غلام عباس تُرکی ادب سے حد متاثر تھے۔ اُنھیں موسیقی سے بھی دلچسپی تھی خصوصاً گٹار بجانے کا اُنھیں بے حد شوق تھا۔ اس کے علاوہ طرنج کے ایک بہترین کھلاڑی تھے۔ ادبی خدمات کے صلے میں اُنھیں حکومتِ پاکستان کی طرف سے ارۂ امتیاز'' عطا کیا گیا۔ غلام عباس ایک باوقار، کامیاب اور تخلیقی زندگی گزار کر کراچی میں انتقال کر گئے۔

غلام عباس کو ابتدا ہی سے اُردو ادب سے دلچسپی رہی اور بچپن ہی میں اُنھوں نے رتن ناتھ سرشار، نا عبدالحلیم شرر، خواجہ حسن نظامی اور مرزا ہادی رسوا کی تقریباً تمام تصانیف پڑھ لی تھیں۔ اُن کا شمار جدید ہ نگاروں کی فہرست میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اُس وقت افسانہ نگاری شروع کی جب انگریزی تعلیم ثرت کے سبب نئی نئی اقدار معاشرے میں نشوونما پا رہی تھیں اور معاشرے میں ایک کشمکش کی کیفیت جس کے نتیجے میں ایسے واقعات ظہور پذیر ہو رہے تھے جو ایک روایت پسند معاشرے کے لیے ناقابلِ ت تھے۔ غلام عباس نے بڑی خوب صورتی اور غیر جذباتی انداز میں ایسے معاشرے کی عکاسی کی ہے۔ باس کے افسانوں کا موضوع کوئی نیا تو نہیں لیکن اُن کے اندازِ بیان نے اُنھیں نیا پن عطا کیا ہے۔ اس میں اُن کے افسانے ''آنندی'' کی مثال دی جاسکتی ہے۔ دراصل وہ معمولی کو غیر معمولی بنانے والے یں۔ وہ جذبات کے تابع نہیں۔ کہانی کا موضوع خواہ کچھ بھی ہو اُن کا قلم غیر جانبداری اور تعقل کے واں دواں رہتا ہے۔

ضانیف: آنندی، جاڑے کی چاندنی، کن رس، دھنک، گوندنی والا تکیہ وغیرہ

کتبہ

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پُر فضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری ہوئی قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ جو دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواریوں ہی میں محدود رہتی ہے مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں پر سے آیا ہوا اور اپنے ساتھ بہت سا خس و خاشاک بہا لایا ہو۔

گرمی کا زمانہ ُسہ پہر کا وقت' سڑکوں پر درختوں کے سائے لمبے ہونے شروع ہو گئے تھے مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا کہ جوتوں کے اندر تلوے جھلسے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گزری تھی۔ سڑک پر جہاں جہاں پانی پڑا تھا بخارات اٹھ رہے تھے۔

شریف حسین کلرک درجہ دوم معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا اور اس بڑے پھاٹک کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے۔ گھر کو لوٹتے ہوئے آدھے راستے تک تانگے میں سوار ہو کر جانا ایک ایسا لطف تھا جو اسے مہینے کے شروع کے صرف چار پانچ روز ہی ملا کرتا تھا اور آج کا دن بھی انھی مبارک دنوں میں سے ایک تھا۔ آج خلافِ معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد بھی اس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ آنے پیسے پڑے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی بیوی مہینے کے شروع ہی میں بچوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی اور گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ دن میں دفتر کے حلوائی سے دو چار پوریاں لے کر کھالی تھیں اور اوپر سے پانی پی کر پیٹ بھر لیا تھا۔ رات کو شہر کے کسی سستے سے ہوٹل میں جانے کی ٹھہرائی تھی۔ بس بے فکری ہی بے فکری تھی۔ گھر میں کچھ ایسا اثاثہ تھا نہیں جس کی رکھوالی کرنی پڑتی، اس لیے وہ آزاد تھا کہ جب چاہے گھر جائے اور چاہے تو ساری رات سڑکوں ہی پر گھومتا رہے۔

تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنی شروع ہوئیں۔ ان میں ٹائپسٹ ، ریکارڈ کیپر، ڈسپیچر ، اکاؤنٹنٹ ، ہیڈکلرک ، سپرنٹنڈنٹ ، غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجہ اور حیثیت کے کلرک تھے اور اسی لحاظ سے ان کی وضع قطع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی۔ مگر بعض ٹائپ خاص طور پر نمایاں تھے۔ سائیکل سوار آدھی آستینوں کی قمیص، خاکی زین کی نیکر اور چپل پہنے، سر پر سولا ہیٹ رکھے، کلائی پر گھڑی باندھے، رنگ دار چشمہ لگائے، بڑی بڑی توندوں والے بابو چھاتا کھولے، منہ میں بیڑی، بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے، ان فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اس امید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گتھیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سلجھا سکے ممکن ہے گھر کی یکسوئی میں ان کا کوئی حل سوجھ جائے مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرہستی کاموں میں ایسے الجھ جاتے کہ انھیں دیکھنے تک کا موقع نہ ملتا اور اگلے روز انھیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا۔

بعض منچلے تانگے، سائیکل اور چھاتے سے بے نیاز، ٹوپی ہاتھ میں، کوٹ کاندھے پر، گریباں کھلا ہوا جسے بٹن ٹوٹ جانے پر انھوں نے سیفٹی پن سے بند کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کے نیچے سے چھاتی کے گھنے بال پسینے میں تر بتر نظر آتے تھے۔ نئے رنگروٹ سستے سلے سلائے ڈھیلے ڈھالے بدقطع سوٹ پہنے، اس گرمی کے عالم میں واسکٹ اور نکٹائی کالر تک سے لیس، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فونٹین پن اور پنسلیں لگائے خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔

گو ان میں زیادہ تر کلرکوں کی مادری زبان ایک ہی تھی مگر وہ لہجہ بگاڑ بگاڑ کر غیر زبان میں باتیں کرنے پر تلے
وئے تھے۔ اس کی وجہ وہ طمانیت نہ تھی جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اس میں باتیں کرنے پر اکساتی ہے
لہ یہ کہ انھیں دفتر میں دن بھر اپنے افسروں سے اسی غیر زبان میں بولنا پڑتا تھا اور اس وقت وہ بات چیت کر کے اس کی
شق بہم پہنچا رہے تھے۔
ن کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر بھولے بھالے ناتجربہ کار بھی جن کی ابھی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں
جنھیں ابھی سکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور ایسے عمر رسیدہ جہاں دیدہ گھاگ بھی جن کی ناک پر سالہا
ل عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا اور جنھیں اس سڑک کے اُتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس تیس

تیس برس ہو چکے تھے۔ بیشتر کارکنوں کی پیٹھ میں گُدّی سے ذرا نیچے خم سا آ گیا تھا اور کُند استروں سے متواتر ڈاڑھی مونڈھتے رہنے کے باعث ان کے گالوں اور ٹھوڑی پر بالوں میں جڑیں پھوٹ نکلی تھیں جنھوں نے بے شمار ننھی ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

پیدل چلنے والے میں بہتیرے لوگ بخوبی جانتے تھے کہ دفتر سے ان کے گھر کو جتنے راستے جاتے ہیں ان کا فاصلہ گنے ہزار قدم ہے۔ ہر شخص افسروں کے چڑ چڑے پن یا ماتحتوں کی نالائقی پر نالاں نظر آتا تھا۔

ایک تانگے کی سواریوں میں ایک کی کمی دیکھ کر شریف حسین لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ تانگا چلا اور تھوڑی دیر میں شہر کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ شریف حسین نے اکنی نکال کر کوچوان کو دی اور گھر کے بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل پڑا جس کی سیڑھیوں کے گرداگرد ہر روز شام کو کہنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دکانیں سجا کرتی تھیں اور میلہ سا لگا کرتا تھا۔ دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ یہاں ملتے تھے۔ اگر مقصد خرید و فروخت نہ ہو تو بھی یہاں اور لوگوں کو چیزیں خریدتے، مول تول کرتے دیکھنا بجائے خود ایک پر لطف تماشا تھا۔

شریف حسین لیکچر باز حکیموں، سنیاسیوں، تعویذ گنڈے بیچنے والے سائینیوں اور کھڑے کھڑے تصویر اُتار دینے والے فوٹوگرافروں کے جمگھٹوں کے پاس ایک ایک دو دو منٹ رکتا، سیر دیکھتا اس طرف جا نکلا جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں۔ یہاں اسے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آئیں۔ ان میں سے بعض ایسی تھیں جو اپنی اصل حالت میں بلاشبہ صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوں گی مگر ان کباڑیوں کے ہاتھ پڑتے پڑتے یا تو ان کی صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی یا ان کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا جس سے وہ بے کار ہو گئی تھیں۔ چینی کے ظروف اور گل دان، ٹیبل لیمپ، گھڑیاں، جلی ہوئی بیڑیاں، چوکھٹے، گراموفون کے کل پرزے، جراحی کے آلات، ستار، بھس بھرا ہرن، پیتل کے لم ڈھینگ، بدھ کا نیم قد مجسمہ ....

ایک دکان پر اس کی نظر سنگِ مرمر کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو معلوم ہوتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اکھاڑا گیا ہے۔ اس کا طول کوئی سوا فٹ تھا اور عرض ایک فٹ۔ شریف حسین نے اس ٹکڑے کو اٹھا کر

دیکھا۔ یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا کہ اس نے محض یہ دیکھنے کے لیے بھلا کباڑی اس کے کیا دام بتائے گا قیمت دریافت کی۔

"تین روپے!" کباڑی نے اس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے مگر آخر اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے ٹکڑا رکھ دیا اور چلنے لگا۔

"کیوں حضرت چل دیے؟ آپ بتائیے کیا دیجیے گا!"

وہ رُک گیا۔ اسے یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم سی آئی کہ اسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی اور اس نے محض اپنے شوقِ تحقیق کو پورا کرنے کے لیے قیمت پوچھی تھی۔ اس نے سوچا، دام اس قدر کم بتاؤ کہ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں۔ کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے کہ یہ کوئی کنگلا ہے جو دکان داروں کا وقت ضائع اور اپنی حرص پوری کرنے آیا ہے۔

"ہم تو ایک روپیا دیں گے۔" یہ کہ کر شریف حسین نے چاہا کہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے مگر اس نے مہلت ہی نہ دی۔

"اجی سنیے تو کچھ زیادہ نہیں دیں گے؟ سوا روپیا بھی نہیں .... اچھا لے جایئے۔"

شریف حسین کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ اب لوٹنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے اس مرمریں ٹکڑے کو اٹھا کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے تو اس سودے کو منسوخ کر دے مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا۔ نہ جانے کباڑی نے اسے اس قدر سستا بیچنا کیوں قبول کیا تھا۔

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اس کے ذہن میں آیا۔ خدا کے کارخانے عجیب ہیں۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔ وہ کلرک درجہ دوم سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے ...... یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ کلرک ہی سہی۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے

مصرف سمجھتا تھا یا اب اسے محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اسے نہ خریدتا تو بڑی بھول ہوتی۔

شروع شروع میں جب وہ ملازم ہوا تھا تو اس کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا مگر دو سال کی سعیٔ لاحاصل کے بعد رفتہ رفتہ اس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور مزاج میں سکون آ چکا تھا مگر اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے نے پھر اس کے خیالوں میں ہل چل ڈال دی۔ مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آئند خیالات ہر روز اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، دفتر جاتے، دفتر سے آتے، کوٹھیوں کے باہر لوگوں کے نام کے بورڈ دیکھ کر، یہاں تک کہ جب مہینا ختم ہوا اور اسے تنخواہ ملی تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کو شہر کے ایک مشہور سنگ تراش کے پاس لے گیا جس نے بہت چابکدستی سے اس پر اس کا نام کندہ کر کے کونوں میں چھوٹی چھوٹی خوش نما بیلیں بنا دیں۔

اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہوا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا تھا۔

سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کتبے پر سے اس اخبار کو اتار ڈالے جس میں سنگ تراش نے اسے لپیٹ دیا تھا اور اس پر ایک نظر اور ڈال لے مگر ہر بار ایک نامعلوم حجاب جیسے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ شاید وہ راہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کتبے کو دیکھ کر اس کے ان خیالات کو بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے اس کے دماغ پر مسلط تھے۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس نے اخبار اُتار پھینکا اور نظریں کتبے کی دلکش تحریر پر گاڑے، دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ جیب سے چابی نکالی۔ قفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کے مکان کے دروازے کے باہر ایسی کوئی جگہ ہی نہیں کہ اس پر کوئی بورڈ لگایا جا سکے۔ اگر جگہ ہوتی بھی تو اس قسم کے کتبے وہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تو بڑا سا مکان چاہیے جس کے پھاٹک کے باہر لگایا جائے تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے۔

قفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا اور سوچنے لگا کہ فی الحال اس کتبے کو کہاں رکھوں۔ اس کے حصہء مکان میں دو کوٹھڑیاں، ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ الماری صرف ایک ہی کوٹھڑی میں تھی مگر اس کے کواڑ نہیں تھے۔ بالآخر اس نے کتبے کو اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کتبے ہی پر پڑتی۔ امیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں اور دفتر کی مشقت کی تکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا آرزوئیں اس کے سینے میں ہیجان پیدا کر دیتیں۔ افسر کی ایک ایک نگاہِ لطف و کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اس کے بیوی بچے نہیں آئے وہ اپنے خیالوں ہی میں مگن رہا۔ نہ دوستوں سے ملتا، نہ کھیل تماشوں میں حصہ لیتا، رات کو جلد ہی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آ جاتا اور سونے سے پہلے گھنٹوں عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں رہتا مگر ان کے آنے کی دیر تھی کہ نہ تو وہ فراغت ہی رہی اور نہ وہ سکون ہی ملا۔ ایک بار پھر گرہستی کے فکروں نے اسے ایسا گھیر لیا کہ مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑ گئیں۔

کتبہ سال بھر تک اسی بے کواڑ کی الماری میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اب اس کے بیٹے کی عمر چار برس کی ہو گئی تھی اور اس کا ہاتھ اس بے کواڑ کی الماری تک بخوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اس خیال سے کہیں کہ اس کا بیٹا کتبے کو گرا نہ دے اسے وہاں سے اٹھا لیا اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔

ساری سردیاں یہ کتبہ اُس صندوق ہی میں پڑا رہا۔ جب گرمی کا موسم آیا تو اس کی بیوی کو گرم کپڑے رکھنے کے لیے اس کے صندوق میں سے فالتو چیزوں کو نکالنا پڑا۔ چنانچہ دوسری چیزوں کے ساتھ بیوی نے کتبہ بھی نکال کر کاٹھ کے اس پرانے بکس میں ڈال دیا جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے، بے بال کے برش، بیکار صابن دانیاں، ٹوٹے

ہوئے کھلونے اور ایسی ہی اور دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔

شریف حسین نے اب اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ ترقی لطیفہ غیبی سے نصیب ہوتی ہے، کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا اور اسے زیادہ تنگی نہ اٹھانا پڑتی۔

پے در پے مایوسیوں کے بعد جب اس کو ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اس کے دل سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے نکل چکے تھے اور کتبے کی یاد تک ذہن سے محو ہو چکی تھی تو اس کے افسروں نے اس کی دیانتداری اور پرانی کارگزاری کا خیال کر کے اسے تین مہینے کے لیے عارضی طور پر درجہ اوّل کے ایک کلرک کی جگہ دے دی جو چھٹی جانا چاہتا تھا۔

جس روز اسے یہ عہدہ ملا اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگا اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا!

اگلے مہینے اس نے نیلام گھر سے ایک سستی سی لکھنے کی میز اور ایک گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اسے پھر کتبے کی یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی سوئی ہوئی امنگیں جاگ اٹھیں۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر کاٹھ کی پیٹی میں سے کتبہ نکالا، صابن سے دھویا، پونچھا اور دیوار کے سہارے میز پر ٹکا دیا۔

یہ زمانہ اس کے لیے بہت کٹھن تھا کیونکہ وہ اپنے افسروں کو اپنی برتر کارگزاری دکھانے کے لیے چھٹی پر گئے ہوئے کلرک سے دگنا کام کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو خوش رکھنے کے لیئے بہت سا ان کا کام بھی کر دیتا۔ گھر پر آدھی رات تک فائلوں میں غرق رہتا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ہاں جب کبھی اسے اس کلرک کی واپسی کا خیال آتا تو اس کا دل بجھ سا جاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا، ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوا لے ...... ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے ..... ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے ......

مگر جب تین مہینے گزر ے تو نہ تو اس کلرک نے چھٹی کی میعاد بڑھوائی اور نہ بیمار ہی پڑا۔ البتہ شریف حسین کو اپنی پرانی جگہ پر آ جانا پڑا۔

اس کے بعد جو دن گزرے وہ اس کے لیے بڑی مایوسی اور افسردگی کے تھے۔ تھوڑی سی خوش حالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اسے اپنی حالت پہلے سے بھی زیادہ ابتر معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کا جی کام میں مطلق نہ لگتا تھا۔ مزاج میں آلکس اور حرکات میں سستی سی پیدا ہونے لگی۔ ہر وقت بے زار بے زار سا رہتا۔ نہ کبھی ہنستا، نہ کسی سے بولتا چالتا مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیورا سے جلد ہی راہ راست پر لے آئے۔

اب اس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا اور چھوٹا چوتھی میں اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی، سینا پرونا سیکھتی اور گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جمالیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ سکول کا کام کیا کرتا۔ چونکہ میز کے ہلنے سے کتبہ گر جانے کا خدشہ رہتا تھا اور پھر اس نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی اس لیے لڑکے نے اسے اٹھا کر پھر اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔ اس عرصے میں کتبے نے کئی جگہیں بدلیں۔ کبھی بے کواڑ کی الماری میں تو کبھی میز پر۔ کبھی صندوقوں کے اوپر تو کبھی چارپائی کے نیچے۔ کبھی بوری میں تو کبھی کاٹھ کے بکس میں۔ ایک دفعہ کسی نے اٹھا کر باورچی خانے کے اس بڑے طاق میں رکھ دیا جس میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھے رہتے تھے۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی۔ دیکھا تو دھوئیں سے اس کا سفید رنگ پیلا پڑ چلا تھا۔ اٹھا کر دھویا، پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا مگر چند ہی روز میں اسے پھر غائب کر دیا گیا اور اس کی جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دیے گئے جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اسے تحفے میں دیے تھے۔ رنگ پیلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہوا بدنما معلوم ہوتا تھا مگر اب کاغذی پھولوں کے سرخ سرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی اور ساری کوٹھڑی دہک اٹھی تھی۔

اب شریف حسین کو ملازم ہوئے پورے بیس سال گزر چکے تھے۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم آ گیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی اس کے دماغ میں خوش حالی و فارغ البالی کے خیالات چکر لگاتے مگر اب ان کی کیفیت پہلے کی سی نہ تھی کہ وہ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو تصورات کا ایک تسلسل ہے کہ پہروں ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اب اکثر اوقات ایک آہ دم بھر میں ان تصورات کو اڑا لے جاتی اور پھر بیٹی کی شادی،

لڑکوں کی تعلیم، اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات پھر ساتھ ہی ساتھ ان کے لیے نوکریوں کی تلاش ..... یہ ایسی فکریں نہ تھیں کہ پل بھر کو بھی اس کے خیال کو کسی اور طرف بھٹکنے دیتیں۔

پچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی۔ اب اس کا بڑا بیٹا ریل کے مال گودام میں کام کرتا تھا۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا اور اس سے چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب مل ملا کے کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے لگ بھگ آمدنی ہو جاتی تھی جس میں بخوبی گزر ہونے لگی تھی۔ علاوہ ازیں اس کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا مگر مندے کے ڈر سے ابھی پورا نہ ہو سکا تھا۔

اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بدولت اس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کر دی تھیں۔ ان ضروری کاموں سے نمٹ کر اس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے مگر اس کی توفیق نہ ہو سکی البتہ کچھ دن مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی مگر پھر جلد ہی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں نے دبانا شروع کر دیا اور زیادہ تر چارپائی ہی پر پڑا رہنے لگا۔

جب اسے پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اٹھا۔ گرم گرم لحاف سے نکلا، پچھلے پہر کی سرد اور تند ہوا تیر کی طرح اس کے سینے میں لگی اور اسے نمونیا ہو گیا۔ بیٹوں نے اس کے بہتیرے علاج معالجے کرائے۔ اس کی بیوی اور بہو دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں مگر افاقہ نہ ہوا اور وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔

اس کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کر رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں سے اسے یہ کتبہ مل گیا۔ بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی۔ کتبے پر باپ کا نام دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اس کی خطاطی و نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔ اچانک سے ایک بات سوجھی جس نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔

اگلے روز وہ کتبے کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا اور اس سے کتبے کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کرائی اور پھر اسی شام اسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

(آنندی)

مشق

1. مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں:

i. کلرکوں میں کس عمر کے لوگ شامل تھے؟

ii. شریف حسین اس دن گھر کے بجائے جامع مسجد کی طرف کیوں چل پڑا؟

iii. شریف حسین نے سنگ مرمر کے ٹکڑے کا کیا مصرف سوچا؟

iv. سنگ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہوا دیکھ کر شریف حسین نے کیا محسوس کیا؟

v. اس افسانے سے کیا اخلاقی سبق حاصل ہوتا ہے؟

2. سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

i. دن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواری ہی میں محدود رہتی ہے۔

ii. دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ یہاں ملتے تھے۔

iii. وہ بڑا غفور الرحیم ہے کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔

iv. دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔

v. ترقی لطیفۂ غیبی سے نصیب ہوتی ہے، کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

3. مندرجہ ذیل جملوں کی تکمیل کے لیے دیے ہوئے جوابات میں سے درست جواب کے سامنے (✓) کا نشان لگائیں۔

i. شریف حسین کو سنگ مرمر کا ٹکڑا ______

ا۔ وراثت میں ملا　　ب۔ راستے میں پڑا ہوا ملا

ج۔ کسی دوست کی طرف سے تحفے میں ملا　　د۔ کباڑی کی دکان سے ملا

ii. شریف حسین نے سنگ مرمر کا ٹکڑا اس لیے خریدا کہ ______

ا۔ اس کی بیوی نے فرمائش کی تھی

ب۔ اس کی قیمت بہت کم تھی۔

ج۔ وہ اسے اپنے گھر کے دروازے پر نصب کرانا چاہتا تھا۔

د۔ قیمت پوچھنے پر کباڑی اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

iii. شریف حسین کے خیال میں سنگِ مرمر کا مصرف یہ تھا کہ ______

ا۔ اسے افسر کو تحفے کے طور پر دے دیا جائے۔

ب۔ اسے کارنس پر سجا دیا جائے۔

ج۔ اس پر اپنا نام کھدوا کر مکان کے دروازے پر لگا دیا جائے۔

د۔ اسے مطالعے کی میز پر رکھ دیا جائے۔

iv. شریف حسین کی موت کے بعد سنگِ مرمر کا ٹکڑا ______

ا۔ یونہی گھر میں پڑا رہا۔　　ب۔ کہیں گم ہو گیا۔

ج۔ بیچ دیا گیا　　د۔ اس کی قبر پر لگا دیا گیا۔

4. ''کتبہ'' کا خلاصہ لکھیں۔

5. غلام عباس پر سوانحی و تنقیدی نوٹ لکھیں۔

6. مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کریں:

مستقبل، معمول، اثاثہ، ادنیٰ و اعلیٰ، بے مصرف۔

تعلیمی سال 2020-21
www.kptbb.gov.pk
member

احمد ندیم قاسمی

ولادت: ۱۹۱۶ء

وفات: ۲۰۰۶ء

احمد ندیم قاسمی کا اصل نام احمد شاہ تھا۔ وہ تحصیل خوشاب کے قصبہ انگہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام پیر غلام نبی تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی علاقے میں حاصل کی اور صادق ایجرٹن کالج بہاولپور سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ شادی کے بعد انھوں نے محکمہ آبکاری میں بطور سب انسپکٹر ملازمت کا آغاز کیا۔

احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، وہ ایک بلند پایہ شاعر، منفرد افسانہ نگار، ممتاز صحافی اور عمدہ نقاد تھے۔ ندیم کی شخصیت پر ان کے چچا خان بہادر حیدر شاہ کا گہرا اثر تھا۔ ان کے چچا علامہ اقبالؒ کے ہم سبق تھے۔ اس طرح ندیم کو شعر وادب سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ندیم نے صحافت میں بھی دلچسپی لی انھوں نے کئی ادبی رسائل شائع کیے جن میں پھول، تعلیم نسواں، نقوش، سحر، فنون اور روزنامہ امروز شامل ہیں۔ بلکہ فنون تو ان کی شخصیت کی پہچان بن گیا۔ وہ ''حرف وحکایت'' کے نام سے اخبارات میں فکاہیہ کالم بھی لکھتے رہے۔

ندیم کا پہلا افسانہ ''بدنصیب بت تراش'' ہے۔ ندیم کی تحریر سادہ اور رواں ہے۔ ان کے افسانوں کا موضوع دیہات کے رہنے والے عام لوگوں کے مسائل اور جذبات ہیں۔ محبت کا جذبہ ایک کائناتی حقیقت ہے۔ دیہات کے لوگ جو محنتی، جفاکش اور زندگی کی بہت سی سہولیات سے محروم ہوتے ہیں لیکن محبت کا جذبہ ان کے ہاں بھی کارفرما ہوتا ہے اور یہی حقیقت ندیم کا موضوع ہے۔ ان کے افسانوں میں حقیقی زندگی کا عکس ملتا ہے۔

اگرچہ ندیم کی زیادہ تر توجہ افسانہ نگاری پر رہی اور اُنھوں نے افسانے تواتر سے لکھے ہیں لیکن اس سے ان کی شاعرانہ عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ان کی شاعری میں ایک طرف کلاسیکی سج دھج ہے تو دوسری طرف جدید انداز وآہنگ بھی موجود ہے۔ ان کی شاعری میں عصری آگہی کا شعور ملتا ہے۔ ان کی بعض نظمیں موسیقیت کے حوالے سے بڑی پُر اثر ہیں۔ اُنھوں نے نظم اور غزل، دونوں کہیں ہیں اور دونوں میں

اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا تاہم اُن کی پہچان غزل کے حوالے سے ہے۔ ان کے مجموعہ کلام ''دشتِ وفا'' پر انھیں آدم جی ایوارڈ بھی ملا ہے۔

مجموعہ ہائے کلام (نثر): چوپال، بگولے، طلوع وغروب، گرداب، آنچل، سیلاب، آبلے، درودیوار، سناٹا، بازارِ حیات، برگِ حنا، گھر سے گھر تک، کپاس کا پھول، نیلا پتھر (افسانے)۔

مجموعہ ہائے کلام (شاعری): دھڑکنیں، رم جھم، شعلۂ گل، دشتِ وفا، محیط، دوام اور لوحِ خاک، بسیط وغیرہ۔

احمد ندیم قاسمی

مائیں

محلے والوں کو ایک دن ایسا بھی یاد نہ تھا جب راجا صاحب اور خواجہ صاحب کی بیویوں میں تُو تکار نہ ہوئی ہو۔ جس روز اس تُو تکار میں دیر ہوجاتی تو وہمی قسم کے لوگ ڈر کے مارے بار بار آسمان کی طرف دیکھنے لگتے کہ ٹوٹ نہ پڑے۔ دونوں بیگمات کے درمیان جھگڑا نہ ہونا ایسا ہی تھا جیسے صبح کا وقت ہوجائے اور سورج نہ نکلے۔

راجہ صاحب اور خواجہ صاحب کے گھر متصل تھے۔ ایک کی دیوار میں کیل گاڑی جاتی تھی تو دوسرے کی دیوار کا پلستر اکھڑ جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک روز دوبارہ جھگڑا ہوگیا۔ معمول کا جھگڑا تو دوپہر کو ہی ہوچکا تھا مگر پھر شام کو ہلکا سا زلزلہ آگیا اور بیگم راجہ یہ سمجھیں کہ بیگم خواجہ نے ملحقہ کمرے میں پلنگ گھسیٹا ہے۔ جھپٹ کر کھڑکی میں منہ ڈالا اور بیگم خواجہ کو وہ بے نقط سنائیں کہ وہ بے چاری زلزلے کو بھی بھول گئیں۔ پھر جب شوہروں نے اپنی اپنی بیگم سے کہا کہ آیۃ الکرسی پڑھو، زلزلہ آرہا ہے، تو جب جا کر بیگم راجہ سارا قصہ سمجھیں۔ وہیں دھب سے بیٹھ گئیں کہ انھوں نے سنا تھا زلزلے میں اگر کوئی لڑکھڑا جائے اور گر پڑے تو اسے مرگی کا مرض ہوجاتا ہے۔ اس وقت بیگم خواجہ نے جھینپی اور ڈری ہوئی بیگم راجہ کو ایسی نفرت سے دیکھا جیسے وہ ان پر تھوکنا چاہتی ہے مگر بے بس ہیں کہ منہ حلق تک خشک ہوچکا ہے۔

نہ تو راجہ صاحب سے بیگم خواجہ اور نہ ہی خواجہ صاحب سے بیگم راجہ پردہ کرتی تھیں۔

کئی بار ایسا ہوا کہ راجہ صاحب شیو بنانے بیٹھے تو بلیڈ ختم پا کر اٹھے اور کھڑکی میں جا کر پکارے ''خواجہ صاحب! ایک بلیڈ عنایت کردیجیے۔'' اور یہ بلیڈ بیگم خواجہ نے راجہ صاحب تک پہنچایا۔ اسی طرح کئی بار خواجہ صاحب کو بوٹ پالش یا گرم پانی کی بوتل درکار ہوئی اور انھوں نے راجہ صاحب کو پکارا تو بیگم راجہ نے

NOT FOR SALE

مطلوبہ چیز خواجہ صاحب کے حوالے کی۔ اس کے باوجود اپنے اپنے گھروں کے اندر شوہروں کی موجودگی میں بھی بیگمات ایسے زناٹے سے جھگڑتیں کہ بات ''میں تجھے اپنی ان آنکھوں سے بیوہ ہوتے دیکھوں'' تک جا پہنچتی۔ مگر پھر کچھ دیر کے بعد راجہ صاحب کھڑکی میں جا کر پکارتے: ''کیوں خواجہ صاحب! واک کو چلیے گا؟'' اور خواجہ صاحب کسی پرلے کمرے سے جواب دیتے ''ضرور چلیں گے۔ میں حاضر ہوا۔'' اور پھر محلے والے، جو کچھ دیر پہلے بیگم راجہ اور بیگم خواجہ کی لڑائی سن چکے تھے، دیکھتے کہ راجہ صاحب اور خواجہ صاحب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی بات پر ہنستے جارہے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ راجہ صاحب اور خواجہ صاحب کے لیے ان بیگموں کی لڑائی معمول بن چکی ہے اور جس طرح وہ چھان بورا خریدنے والے سے یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے کہ یوں چنگھاڑ کر آواز نہ لگایا کرو، اسی طرح بیگمات کے جھگڑے میں مداخلت کو بھی بے کار سمجھتے ہیں۔ ایک بار محلے کے ایک بزرگ نے دونوں کو روک کر کہا تھا ''' آپ بھلے لوگ ہیں اپنی بیگمات کو لڑائی جھگڑے سے روکیے، پورا محلّہ بدنام ہورہا ہے۔'' اس پر راجہ صاحب نے نہایت ادب سے کہا تھا ''یہ عورتوں کا معاملہ ہے۔ ہم آپ ان کے معاملے میں دخل دیں گے تو اچھے نہیں لگیں گے۔ آپ اگر اپنی بیگم صاحبہ کو ان کے پاس بھیج کر انھیں سمجھا سکیں تو سبحان اللہ، ورنہ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ اکٹھے رکھے ہوئے دو برتن بھی ٹکرا کر بج اٹھتے ہیں تو یہ دونوں تو ماشاء اللہ جیتی جاگتی عورتیں ہیں'' اور خواجہ صاحب نے فوراً کہا تھا ''جیتی جاگتی اور بولتی چالتی عورتیں۔'' اس پر دونوں ہنس پڑے تھے اور محلے کے بزرگ بھی اپنی مسکراہٹ پھیلانے میں ناکام ہوکر بچے کی طرح شرما کر پلٹ گئے تھے۔ جب دونوں بیگمات جھگڑتی تھیں تو ان کی باتوں میں الزام تراشی بہت کم اور بددعائیں بہت زیادہ ہوتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ محلے والوں کو جھگڑے کا زیادہ لطف نہیں آتا تھا۔ مردوں نے تو سرے سے دلچسپی لینا ہی چھوڑ دی تھی۔ البتہ عورتیں بیگم راجہ یا بیگم خواجہ کی پہلی ہی آواز پر لپک کر چھتوں پر چڑھ جاتیں یا کھڑکیوں میں سے آدھی آدھی باہر نکل آتیں مگر جب جھگڑا ختم ہوتا تو یوں اداس چہرے لیے پلٹتیں جیسے سونے کی تلاش میں پہاڑ کھود کر خالی ہاتھ آرہی ہوں۔ اُنھیں یہ سوچ کر بہت دکھ ہوتا تھا

NOT FOR SALE

کہ نہ تو بیگم راجہ نے بیگم خواجہ کے کسی آشنا کی نشاندہی کی ہے اور نہ بیگم خواجہ نے بیگم راجہ کو کوئی اخلاق سوز * طعنہ دیا ہے۔ یہ سمجھیے کہ محلے کی عورتوں کو یہ جھگڑا مجبوراً سننا پڑتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے مریض بے نمک مرچ کا کھانا کھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

یہ جھگڑا جس طرح بے وجہ شروع ہوتا تھا اُسی طرح بے وجہ ختم بھی ہو جاتا تھا۔ مثلاً بیگم راجہ کے بیٹے کی گیند اچھل کر کھڑکی میں سے گزری اور بیگم خواجہ کی بالٹی میں جا گری۔ اب بیگم راجہ چیخ رہی ہیں کہ بیگم خواجہ نے جان بوجھ کر گیند بھگو دی کہ گیلی مٹی سے بھر جائے اور مٹی سے بچے کے ہاتھ بھر جائیں اور ہاتھوں سے وہ اپنے کپڑے خراب کر لے اور بیگم راجہ کو پھر سے کپڑے دھونے پڑیں اور صابن الگ خرچ ہو اور وقت الگ ضائع ہو۔ ادھر بیگم خواجہ کا اصرار ہوتا تھا کہ گیند بچے نے نہیں، بیگم راجہ نے پھینکی ہے اور تاک کر بالٹی ہی میں پھینکی ہے کیونکہ نل بند ہو چکا تھا اور اب پینے کے پانی کے لیے بہشتی سے ایک مشک کے لیے کہا جائے جو غضب خدا کا ایک مشک کے پورے دو آنے لیتا ہے۔

بات بڑھتے بڑھتے اس انتہا کو پہنچ جاتی تھی۔ ''اللہ کرے تیرا بچہ مرجائے''۔

''میرا بچہ خدا کا مال ہے، پر اللہ کرے پہلے تیرا بچہ مرے کہ میں اپنی آنکھوں سے تجھے اپنے یہ چڑیلوں جیسے بال نوچتے دیکھوں۔''

''میں کبھی کھڑکی میں سے کود کر آؤں گی اور تیری زبان پر انگار رکھ دوں گی۔''

''اس سے پہلے میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گی؟''

''ٹانگیں ٹوٹیں تیری اور تیرے ہوتوں سوتوں کی۔''

پھر دونوں ایک دوسری کو گھور کے دیکھتیں۔ پھر دونوں غصے سے رونے لگتیں اور کچھ دیر کے بعد ...ں اپنے گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتیں۔

جھگڑے کا آغاز عموماً بیگم راجہ کی طرف سے ہوتا تھا۔ بیگم خواجہ کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ جیسے اس ... کے انتظار میں ہوتی تھیں۔ انھوں نے ایک بار بھی بیگم راجہ کو نظر انداز نہ کیا۔

...ی ضرورتوں کے تحت تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ۔

مگر ایک روز یہ عجیب واقعہ ہوا کہ بیگم خواجہ آنکھوں میں خون اُتارے کھڑکی میں آئیں اور بولیں

''اے بیگم صاحبہ! ذرا سامنے تو آ۔''

بیگم راجہ خم ٹھونک کر میدان میں اُتریں اور حسب معمول جھگڑے کا آغاز کرنے ہی لگی تھیں کہ بیگم خواجہ نے آغاز کر دیا۔ وہ بولیں ''تیرے لڑکے نے آج میرے لال کی ران میں پنسل ماری ہے۔ باریک سکہ اس کے چڑے میں گھس گیا ہے اور وہ رو رو کر اپنی جان ہلکان کیے دے رہا ہے میں اگر اس کے بدلے میں تیرے لونڈے کے پیٹ میں چاقو گاڑ دوں، پھر؟

''پھر یہی کہ میں تیرا کلیجہ کچا چبالوں گی۔'' بیگم راجہ نے جواب دیا۔

''غضب خدا کا''۔ بیگم خواجہ بگڑیں۔ ''میں کہتی ہوں تیرے لڑکے نے میرے لال کو زخمی کر دیا ہے اور انصاف دیکھو لوگو! کہتی ہے میں تیرا کلیجہ چبالوں گی''۔

''اری تو میرے بیٹے کے پیٹ میں چاقو گاڑے گی تو پھر میں تیرا کلیجہ نہیں چبالوں گی تو کیا تیری دعوت کروں گی؟'' بیگم راجہ کڑکیں ''پر تیرا بیٹا ہے کہاں، ذرا دکھاؤ تو سہی اسے کوئی خراش بھی آئی ہے کہ تو عادت پوری کرنے کو بک جھک رہی ہے۔''

یکایک بیگم خواجہ پلٹیں اور پرلے کمرے سے اپنے بچے کو اٹھا کر کھڑکی میں بٹھا دیا۔ رو رو کر اس نے اپنی آنکھیں سُجالی تھیں پھر بیگم خواجہ نے اس کی ران پر سے پاجامہ ہٹایا اور بولیں ''لے دیکھ لے اپنی منحوس آنکھوں سے۔''

''آنکھیں تو منحوس ہوں گی تیرے باپ دادا کی''۔ بیگم راجہ نے کہا اور پھر کھڑکی کے پاس آ کر بولیں۔ ''پر ذرا دیکھوں تو''۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ دم بخود ہو کر رہ گئیں۔ ایک لمحہ یونہی چپ چاپ کھڑی رہیں، پھر انگلی سے بچے کی ران کے اس مقام کو چھوا جہاں سے نکیلی پنسل نے جلد ادھیڑ دی تھی۔ خون رس کر جم گیا تھا اور آس پاس سرخی کا دائرہ سا بن گیا تھا۔ بچہ انگلی کے مس سے بلبلا اٹھا تو بیگم راجہ نے دونوں ہاتھ بڑھا بیگم خواجہ کے

بچے کو اٹھا لیا اور اسے اپنے کولھے پر بٹھا کر تھپکنے لگیں اور رونے لگیں اور کہنے لگیں "آگ لگے ان ہاتھوں کو جنھوں نے تیرے پھول سے جسم کو ادھیڑا ہے۔ آنے دے کوشہ کو۔ تیرے سامنے ایسی ماردوں گی ایسی ماردوں گی کہ طبیعت ہری ہوجائے گی۔" پھر وہ بیگم خواجہ کے بیٹے کے آنسو پونچھنے لگیں اور اسے چومنے لگیں۔ "تو جگ جگ جئے، تو سہرے باندھے۔ میں تو کہتی ہوں تو خواجہ خضر کی عمر پائے، بس اللہ کرے تیری ماں مرجائے۔"

یہ کہہ کر بیگم خواجہ کی طرف دیکھا تو وہ بھی کھڑی اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں اور اپنے مرنے کی بددعا سن کر آنسوؤں میں مسکرانے لگی تھیں۔

اتنے میں بیگم راجہ کا بیٹا آگیا۔ اسے دیکھتے ہی بیگم راجہ اس پر جھپٹیں اور اکٹھے چار پانچ تھپڑ اس زناٹے کے مارے کہ بچے کی چیخیں پورے محلے میں گونج گئیں۔ پھر وہ باورچی خانے سے ایک لکڑی اٹھا لائیں اور بولیں "تو نے اس بچے کو ایک زخم دیا ہے، آج میں تجھے ایسے ہی ایک سو زخم دوں گی تاکہ تجھے عمر بھر یاد رہے کہ دوسروں کے جسم میں بھی جان ہوتی ہے"۔

بیگم راجہ کا بیٹا ماں کے تیور اور لکڑی دیکھ کر چیخا، اور پھر کھڑکی میں سے بیگم خواجہ گرجیں "یہ لکڑی رکھ دے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"کیوں؟" بیگم خواجہ کی یہ مداخلت بہت بری لگی "تو کون ہوتی ہے مجھے روکنے والی؟ میں اسے ضرور سزا دوں گی۔" پھر وہ اپنے بچے کے پاس جا کر کڑکیں "پھر مارے گا کسی کو؟" اور جواب سننے سے پہلے انھوں نے لکڑی بچے کے پیٹ پر دے ماری۔

اچانک بیگم خواجہ کھڑکی میں سے کود کے آئیں اور بیگم راجہ کے بلکتے ہوئے بیٹے کو سینے سے لگا کر ایک طرف کھڑی ہوگئیں "کون سا غضب آگیا آخر۔ ذرا سی پنسل ہی تو لگی ہے۔"

"یہ ذرا سی پنسل ہے؟" بیگم راجہ نے بیگم خواجہ کے بیٹے کی ران پر سے پاجامہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر زخم کی بڑھتی ہوئی سرخی دیکھ کر وہ روتی ہوئی بچے سے لپٹ گئیں اور اسے سینے سے لگا کر اٹھ کھڑی

ہوئیں۔

آمنے سامنے کھڑی بیگموں کو یکایک احساس ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے بچوں کو سینے سے چمٹائے رو رہی ہیں۔ اس صورت حال کا انکشاف ان پر ایک ساتھ ہوا، کیونکہ دونوں ایک ساتھ ہنسنے لگیں۔ پھر بیگم خواجہ ہنسی روک کر بولیں۔

"ہائے ہم بھی کیسی پاگل ہیں!"

"پاگل ہوگی تو۔" بیگم راجہ بولیں اور ساتھ ہی زور کا قہقہہ مارا۔ بیگم خواجہ نے اس قہقہے کا ساتھ دیا۔ پھر دونوں ایک دم رک گئیں کیونکہ دونوں بچے اپنی ماؤں کو ہنستا دیکھ کر بے اختیار ہنسنے لگے تھے۔

(کپاس کا پھول)

مشق

۱۔ سبق کے مطابق درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

(الف) دونوں بیگمات کے برعکس اُن کے شوہروں کے تعلقات کیسے تھے؟

(ب) لڑائی کا آغاز عموماً کس کی طرف سے ہوتا تھا؟ بیگم راجہ یہ جھگڑالو عورت تھی

(ج) زلزلہ آنے پر بیگم راجہ کا کیا ردِعمل تھا؟ آیت الکرسی پڑھتی تھی۔

(د) محلّے کے بزرگ کے سمجھانے پر راجہ صاحب کا کیا جواب تھا؟

(ہ) پانی کی بالٹی میں گیند گرنے پر دونوں بیگمات کا کیا مُوقف تھا؟

(و) بچے کا زخم دیکھ کر بیگم راجہ نے کیا ردِعمل ظاہر کیا؟

۲۔ "شاید یہی وجہ تھی کہ محلّے والوں کو جھگڑے کا زیادہ لطف نہیں آتا تھا" اس جملے میں ایک مخصوص ذہنیت کی عکاسی ہوتی ہے۔ وضاحت کریں۔

۳۔ متن کے مطابق خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) بیگم خواجہ کو وہ ______ سنائیں کہ وہ بے چاری زلزلے کو بھول گئی۔

(ب) اکٹھے رکھے ہوئے دو برتن بھی ______ کر بجتے ہیں۔

(ج) اُن کی باتوں میں ______ کم اور بددُعائیں زیادہ ہوتی تھیں۔

(د) جیسے مریض ______ کا کھانا کھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

(ہ) بیگم خواجہ اپنے ______ کی بددُعائیں کر مُسکرا رہی تھی۔

۴۔ ان الفاظ پر سامنے دیے گئے معنی کے مطابق اعراب لگائیں

عالم (علم والا)   عالم (حالت، دُنیا)   علم (معلومات)   علم (جھنڈا)

ملک (وطن)   ملک (جاگیر، جائداد)   ملک (فرشتہ)   ملک (بادشاہ، حاکم)

۵۔ اس سبق میں امدادی افعال کی نشاندہی کریں۔

رموزِ اوقاف:

وقفہ: (؛) جب سکتے سے زیادہ ٹھہرنے کی ضرورت ہو وہاں وقفہ استعمال کیا جاتا ہے۔اس کا استعمال درج ذیل مواقع پر ہوتا ہے۔

- جملے کے لمبے لمبے اجزا کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے لیے۔
- جملوں کے مختلف اجزا پر زیادہ تاکید دینے کے لیے جیسے:
  تم آؤ گے تو ہمیں خوشی ہوگی؛ نہ آؤ گے، تو صبر کرلیں گے۔
- جن جملوں کے لمبے لمبے اجزا کے درمیان ورنہ، اس لیے، لہٰذا، اگرچہ، حالاں کہ وغیرہ جیسے الفاظ آئیں وہاں ذہن کو سمجھنے کا موقع دینے کے لیے یہ علامت لگائی جاتی ہے۔

شوکت صدیقی

ولادت: ۱۹۲۳ء   وفات: ۲۰۰۶ء

شوکت حسین صدیقی لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ ہائی سکول لکھنؤ سے میٹرک پاس کیا اور اُس کے بعد ایم۔اے تک پرائیویٹ تعلیم حاصل کی۔قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آئے اور پھر کراچی میں رہائش اختیار کی۔اُنھوں نے عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔وہ ترکش، جدید ادب، فیض آباد، ٹائمز آف کراچی، مارننگ نیوز اور الفتح وغیرہ سے منسلک رہے۔

شوکت صدیقی ابتدا ہی سے ادبی ذوق کے مالک تھے۔اُنھوں نے ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ اُن کے افسانوں کے پہلے مجموعے نے اُن کے مستقبل کی نشاندہی کردی۔وہ بیک وقت ایک افسانہ نگار، ناول نگار، صحافی اور کالم نویس تھے۔اُن کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ''تمغۂ حُسنِ کارکردگی'' اور ''لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ'' عطا کیا گیا۔

شوکت صدیقی نے ناول بھی لکھے اور افسانے بھی۔وہ اُردو ناول کے فکری اور فنی ارتقا کے سلسلے میں ایک اہم نام ہیں۔اُن کے ناول ''خُدا کی بستی'' پر اُنھیں آدم جی ایوارڈ ملا۔شوکت صدیقی کی کامیابی کا راز اُن کی حقیقت نگاری ہے۔وہ معاشرے کے تلخ حقائق اور مسائل کو اپنی تحریروں کا موضوع بناتے ہیں۔اس کے علاوہ اُن کی کردار نگاری بھی قابلِ ذکر ہے۔یہ کردار زندۂ جاوید اور ہمارے اردگرد معاشرے میں موجود ہیں۔شوکت صدیقی اپنے افسانوں اور ناولوں میں نہایت سادہ سلجھی ہوئی اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں۔اُن کے ہاں مکالمہ نگاری، کردار نگاری، جذبات نگاری اور منظر نگاری کے بہترین مرقعے ملتے ہیں۔

تصانیف: تیسرا آدمی، اندھیرا اور اندھیرا، راتوں کا شہر، کیمیا گر، کمیں گاہ، خُدا کی بستی، جانگلوس، چار دیواری، تانتیا، شریف آدمی، رات کی آنکھیں، کوکا بیلی وغیرہ ۔

شوکت صدیقی

سیاہ فام

سڑک کے ایک موڑ سے کئی آوارہ کتے نکل کر زور زور سے بھونکنے لگے اُس نے سامنے نظر ڈالی تو دل دھک سے رہ گیا۔ ایک سایہ کار کی تیز روشنی میں لہرایا۔ اندھیرے میں ایک دردناک انسانی چیخ اُبھری، کار اچانک زور سے اُچھلی اور سڑک کے کنارے لگے ہوئے بجلی کے کھمبے سے جا کر زور سے ٹکرا گئی۔

یہ سب کچھ آناً فاناً ہوا۔ وہ ذرا دیر تک تو ہکا بکا سا اسٹیرنگ پر بت بنا بیٹھا رہا۔ پھر وہ کار سے نکل کر باہر آ گیا۔ سڑک کے بیچوں بیچ کوئی پڑا کراہ رہا تھا وہ سہا ہوا اس کے پاس گیا تاروں کی دھندلی روشنی میں اس نے دیکھا، ایک لمبا چوڑا آدمی اوندھے منہ لیٹا تھا۔ اس کے چاروں طرف خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ دور دور تک کسی انسان کا پتہ نہ تھا۔ ہر طرف گہرا اندھیرا تھا اور میلوں تک پھیلی ہوئی سنسان سڑک، موقع غنیمت تھا۔ درانی نے کپکپاتے ہاتھوں سے اس کو گھسیٹ کر سڑک کے کنارے کیا اور جلدی سے کار کے اندر جا کر اس کو اسٹارٹ کرنے لگا مگر کار اسٹارٹ نہ ہوئی۔

جب وہ ہر کوشش کے باوجود بھی کار اسٹارٹ نہ کر سکا تو مجبوراً اتر کر نیچے آ گیا۔ ایک بار وہ پھر ڈرتے ڈرتے خون میں ڈوبے ہوئے آدمی کے پاس گیا، اب اس نے کراہنا بند کر دیا اور آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ درانی اس کے قریب وحشت زدہ سا کھڑا سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ کئی بار اس نے سوچا کہ کار چھوڑ کر وہاں سے پیدل ہی بھاگ کھڑا ہو مگر وہ ایسا نہ کر سکا اس لیے کہ کار کی موجودگی اس کے خلاف پورا پورا ثبوت بہم پہنچا سکتی تھی۔

کوئی پندرہ منٹ بعد سڑک پر موٹر کی روشنی جھلکتی نظر آئی۔

ذرا ہی دیر بعد ایک ٹرک کھڑکھڑاتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ اس نے اپنے حواس درست کیے۔ آگے بڑھ کر ٹرک کو رکوایا اور ڈرائیور کے قریب جا کر کہنے لگا۔

''ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، مجھ کو فوراً تھانے تک لے چلو۔''

ٹرک کے اندر ڈرائیور کے ہمراہ ایک آدمی اور بیٹھا تھا۔ دونوں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ اس کے سامنے

خون میں لتھڑا ہوا ایک کالا کلوٹا آدمی پڑا تھا۔ ذرا آگے بڑھ کر ایک موٹر کھڑی تھی جس کا اگلا حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ڈرائیور نے گھبرا کر پوچھا۔

''بڑا زبردست ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ کیا ایک دم سامنے آ گیا تھا؟''

درانی تیزی سے بولا ''باتیں کرنے کا وقت نہیں۔ مجھ کو جلدی لے چلو؟''

وہ جھٹ سے ٹرک پر چڑھ گیا اور ٹرک شور کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ تھانہ وہاں سے کوئی میل بھر پر تھا۔ درانی سڑک سے اُتر کر سیدھا تھانہ کے اندر چلا گیا۔ رات کی ڈیوٹی پر جو سب انسپکٹر تعینات تھا دروازے پر ہی درانی سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ اس وقت گشت پر جا رہا تھا۔ درانی نے اس کو علیٰحدہ لے جا کر حادثہ کی نوعیت بتائی اور جب ذرا اطمینان ہو گیا تو اس کو لیے ڈیوٹی روم میں پہنچا۔ چھوٹے بھائی کو ٹیلیفون پر ہدایت کی کہ وہ اسٹیشن ویگن لے کر فوراً تھانہ آ جائے۔

آدھ گھنٹہ کے اندر اندر اسٹیشن ویگن تھانہ پر موجود تھی۔ درانی اور سب انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ہمراہ اس میں سوار ہو کر موقع واردات کی طرف چل دیے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو سڑک اسی طرح سنسان پڑی تھی۔ وہ آدمی خاک پر بے سدھ پڑا تھا۔ سب انسپکٹر نے اس کے جسم کو چھو کر دیکھا۔ ابھی تک وہ زندہ تھا۔ البتہ بہت سا خون بہہ چکا تھا۔ سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ زخمی کو اسٹیشن ویگن میں ڈال کر ہسپتال پہنچایا گیا۔

رات کے پچھلے پہر جب درانی گھر پہنچا تو بہت تھکا ہوا تھا۔ ہسپتال سے اس کو یہ رپورٹ مل ہی چکی تھی کہ زخم مہلک نہیں آئے ہیں البتہ ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئی تھی۔ لہٰذا وہ ایکسیڈنٹ سے بے نیاز ہو کر اس وقت صرف یہ سوچ رہا تھا کہ کار کو جو نقصان پہنچا ہے اس کے عوض بیمہ کمپنی سے کس طرح پانچ ہزار کی رقم وصول کی جائے۔ وہ دیر تک بستر پر پڑا اس کے متعلق اسکیم بناتا رہا۔

یہ تو پتہ نہیں پولیس کے روزنامچے میں حادثے کی کیا رپورٹ درج کی گئی البتہ بعض اخبارات میں اس ایکسیڈنٹ کے متعلق جو خبریں شائع ہوئیں ان میں سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اس آدمی کا نام عبداللہ تھا۔ رکشا چلایا کرتا تھا۔ حادثہ کی رات وہ مالک کو رکشا واپس کر کے گھر لوٹ رہا تھا۔ نکلسن روڈ کے موڑ پر وہ ایک تیز رفتار کار کی

زد میں آ گیا۔ زخم ایسا کاری لگا تھا کہ وہ اسی وقت بے ہوش ہو گیا۔ جب اس کو ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھا۔

عبداللہ ڈیڑھ ماہ تک سرجیکل وارڈ میں پڑا رہا۔ جس روز اس کو ہسپتال سے چھٹی ملی تو اس کو وہاں لینے صرف اس کی بیوی آئی تھی۔ کالا کلوٹا عبداللہ جس کی ایک ٹانگ کٹ چکی تھی اور جواب بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا جسم کبڑوں کی طرح جھک گیا تھا۔

اب وہ تمام دن کوٹھڑی میں پڑا کھانستا رہا۔ بات بات پر بیوی سے لڑ پڑتا۔ اس کا رنگ اور سیاہ ہو گیا تھا۔ داڑھی بڑھ کر بے ترتیب ہو گئی تھی۔ آنکھوں سے ہر وقت وحشت برسا کرتی۔ اس کا چہرہ روز بروز خوفناک ہوتا جا رہا تھا۔ ملنے جلنے والے جو ازراہ ہمدردی کبھی کبھار اس کے پاس آ کر گھڑی دو گھڑی بیٹھ جاتے تھے۔ اب وہ بھی اس سے کترانے لگے تھے۔

عبداللہ جس محلہ میں رہتا تھا اس کی آبادی زیادہ تر نچلے طبقے کے افراد پر مشتمل تھی۔ بستی میں ہر طرف جھکی ہوئی چھتوں والے نیم پختہ مکانات تھے۔ چند قدیم وضع کی عمارتیں تھیں جو امتدادِ زمانہ سے کھنڈر بن گئی تھیں۔ درمیان میں انگریزوں کا پرانا قبرستان تھا جس کے چاروں طرف پختہ چار دیواری تھی۔ قبرستان میں ایک اُونچی سی لاٹ تھی جس پر سنگ مرمر کا ایک کتبہ آویزاں تھا۔ یہ کسی کرنل کی قبر تھی جس کی تمام زندگی میدان جنگ میں غنیم سے لڑتے گزری تھی مگر اس کی موت خودکشی سے واقع ہوئی تھی۔ محلّہ بھر میں مشہور تھا کہ مرنے کے بعد کرنل بھوت بن گیا ہے۔ اکثر سنسان راتوں میں لوگوں نے اس کو گلیوں میں منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ جب کبھی بھی وہ کسی کو نظر آیا تو اس کی زبان پر ایک ہی سوال ہوتا۔ ''مکھن ٹوش۔'' خدا معلوم اُس کی اِس طلب کا کیا پس منظر تھا البتہ اتنا ضرور ہے کہ جس کسی سے بھی اس کی مڈبھیڑ ہوئی اس نے ہمیشہ یہی آواز سنی۔ اور یہ آواز اتنی خوفناک ہوتی کہ اچھے بھلے جی دار آدمی کے اوسان خطا ہو جاتے اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا۔ یہی وجہ تھی کہ قبرستان کے احاطہ کے ساتھ ساتھ جو پتلی سی گلی جاتی تھی رات گئے راہ گیر اس سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

اس کے علاوہ محلّہ کی دوسری خصوصیت سکینہ بیگم تھیں۔ جن کے شوہر لاکھوں روپے کی جائیداد چھوڑ کر مرے تھے۔ صرف ایک لڑکا تھا وہ بھی چند سال ہوئے کہ گھر سے روٹھ کر چلا گیا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس نے ماں سے

ارہر کی کھچڑی کی فرمائش کی تھی۔ سکینہ بیگم کی اس روز طبیعت کچھ ناساز تھی، باورچی نے کچھ توجہ نہ دی۔ دسترخوان پر کھچڑی نہ پاکر صاحب زادے بغیر کچھ کھائے پیے دسترخوان سے اُٹھ گئے اس کے بعد اُس کو کسی نے نہیں دیکھا۔ البتہ کچھ عرصہ بعد اطلاع ملی کہ وہ ٹرین کے حادثہ میں ہلاک ہو گیا۔ اِس بات کے عینی گواہ تھے مگر سکینہ بیگم کسی طرح اس بات کو ماننے پر رضامند نہ تھیں۔ اگر کوئی ایسی بات کہتا بھی تو اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتیں۔ ایک سانس میں ہزاروں کوسنے دے ڈالتیں۔ لہٰذا سب نے اس حقیقت کا ان سے اظہار ہی کرنا چھوڑ دیا تھا بلکہ بعض عورتوں نے ان کو ٹھگنا شروع کر دیا وہ آئے دن کوئی نت نیا قضیہ گھڑ لاتیں اور ان سے کچھ نہ کچھ اینٹھ کر لے جاتیں۔ ہر تہوار پر وہ اپنے بیٹے کا نیا جوڑا سلواتیں، خاندان کی ہر خوبصورت لڑکی کے لیے اپنے بیٹے کا پیغام دے دیتیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مشاطائیں بلواتیں اور ان کے ذریعہ بہو تلاش کرواتیں۔ کوئی پوچھتا تو مسکرا کر کہتیں۔ ''بس آنے ہی والا ہے۔ ابھی کل ہی تو ایک شخص آیا تھا جس سے اس نے میری خیریت دریافت کروائی ہے۔'' کبھی کبھی وہ اس کے خط کا بھی حوالہ دیتیں اور پھر مزے لے لے کر خواہ مخواہ ایک طول طویل قصہ سنا ڈالتیں۔ ہر روز وہ اُس کے آنے کا انتظار کرتیں۔ ہر شام ارہر کی کھچڑی تیار ہوتی اور صبح باسی ہو جاتی جس سے محلّہ کے کسی مسکین کا پیٹ پل جاتا۔ کئی سال سے یہی سلسلہ چل رہا تھا۔ جب سے عبداللہ ایک ٹانگ سے معذور ہوا تھا اس کھچڑی میں سے اُس کو بھی مل جاتا۔ سویرے ہی سویرے اس کی بیوی بارہ دری کی ڈیوڑھی پر پہنچ جاتی اور جب واپس لوٹتی تو دونوں میاں بیوی کے لیے ایک وقت کے کھانے کا بندوبست ہو جاتا۔

عبداللہ کے دن اسی طرح کٹ رہے تھے اتفاق سے اس کی بیوی بیمار پڑ گئی۔ طبیعت اچانک ایسی گڑبڑ ہوئی کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئی۔ عبداللہ کو متواتر کئی روز فاقہ کرنا پڑا۔ آخر جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو ایک روز رات گئے اس نے بیساکھی سنبھالی اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دسمبر کا مہینہ تھا آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ سرِ شام ہی سے محلّہ میں سناٹا پڑ گیا تھا۔ عبداللہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قبرستان سے ملحق تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوا تو اس کو دھندلی روشنی میں کسی آدمی کا سایہ نظر آیا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ عبداللہ وہیں ٹھہر گیا۔ جب وہ قریب آیا تو عبداللہ نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا وہ آدمی ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے عبداللہ

کے چہرے کی جانب دیکھا اور یکبارگی اس کی گھگھی بندھ گئی۔ پھر وہ حلق کے اندر سے نہ جانے کیسی کیسی آوازیں نکالتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ میں دبا ہوا ایک بنڈل بھی گر پڑا۔

عبداللہ خود بھی گھبرا گیا۔ لمحہ بھر تک وہ سکتے کے سے عالم میں کھڑا رہا پھر اس نے بڑھ کر بنڈل اٹھایا۔ کھول کر دیکھا۔ گرم گرم امرتیاں تھیں۔ عبداللہ کی باچھیں کھل گئیں۔ فوراً ہی گھر پہنچا۔ دونوں میاں بیوی نے مزا لے کر امرتیاں کھائیں۔

دوسرے روز رات کو عبداللہ پھر گلی میں پہنچا اس وقت کچھ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ سردی اور بڑھ گئی تھی۔ وہ دیر تک گلی میں کھڑا رہا مگر کوئی بھولے سے بھی اس طرف سے نہیں گزرا۔ سردی کے مارے اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ آخر وہ جب مایوس ہو کر واپس لوٹ رہا تھا تو اچانک ایک مونگ پھلی بیچنے والا گلی میں داخل ہوا۔ عبداللہ نے اس کے قریب جا کر بجائے ہاتھ پھیلانے کے ناک میں منمنا کر کہا۔

''ذرا ٹھہر جانا بھائی!''

عبداللہ کا ہیبت ناک چہرہ، بھوتوں کا سا لہجہ اور سنسان رات۔ اس آدمی پر کچھ ایسا خوف طاری ہوا کہ کئی لمحہ تک تو وہ آنکھیں پھاڑ چیخنے کی بے سود کوشش کرتا رہا اور پھر بے ہوش کر وہیں گر پڑا۔ عبداللہ نے اطمینان سے چادر میں سوا سیر مونگ پھلیاں باندھیں اور چپ چاپ گھر آ گیا۔

ان دو واقعات سے محلہ بھر میں سنسنی پھیل گئی۔ لوگوں میں چرچا ہونے لگا کہ کرنل کا بھوت اب راہگیروں کو بہت پریشان کرنے لگا ہے۔ پاس پڑوس کے رہنے والوں پر خاصی دہشت طاری ہو گئی تھی۔ عبداللہ نے اس خوف سے اور بھی فائدہ اٹھایا جب راستے سنسان پڑ جاتے تو وہ چپ چاپ گلی کے اندھیرے میں دبک کر کھڑا ہو جاتا۔ ادھر کوئی راہگیر گلی میں داخل ہوا اور وہ اس کی تاک میں لگ گیا۔ قریب آتے ہی وہ بڑی ہیبت ناک آواز میں کہتا۔ ''مکھن ٹوش'' اب اس نے باقاعدہ کرنل کے بھوت کا روپ اختیار کر لیا تھا اور اس کا یہ حربہ کارگر بھی ثابت ہوا۔ پہلے وہ صرف کھانے پینے کی چیزوں پر اکتفا کر لیتا تھا پھر ایسا بھی ہوا کہ اگر آدمی بے ہوش ہو جاتا تو وہ اس کی جیبیں ٹٹول کر ساری نقدی اپنے قبضے میں کر لیتا۔

محلہ میں کرنل کے بھوت کا چرچا روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگوں میں خوف و ہراس زیادہ پھیل گیا تھا۔ ادھر عبداللہ اپنے کام میں اتنا منجھ گیا تھا اور اس کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اکثر تو وہ چھپ کر آدمی کو دبوچ بھی لیتا تھا کسی کو صرف قہقہہ لگا کر خوف زدہ کر دیتا۔ کسی کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ کسی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ جیسا موقع ہوتا وہ اسی مناسبت سے نیا حربہ استعمال کرتا۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ راہگیروں نے رات کو قبرستان کے پاس والی گلی سے بالکل گزرنا چھوڑ دیا۔ مگر عبداللہ پر اس کا اثر نہ ہوا۔ اس نے گلی سے باہر نکل کر سنسان راتوں کے اندھیرے میں راہگیروں سے اپنا ''ٹیکس'' وصول کرنا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ بھی ایک مدت تک چلتا رہا۔

محلہ والے کچھ اس قدر خوفزدہ ہو گئے تھے کہ سر شام ہی ہر طرف ہو کا عالم طاری ہو جاتا اور اس ہولناک سناٹے میں عبداللہ اطمینان سے کسی گلی کی نکڑ پر دیوار سے لگا ہوا موجود ہوتا۔ اس کا چہرہ اور بھی خوفناک ہو گیا تھا۔ آنکھوں کی وحشت بڑھ گئی تھی اور آواز میں دم توڑتے ہوئے انسان کا سا کرب پیدا ہو گیا تھا۔ وہ دن بھر کوٹھڑی میں پڑا سویا کرتا اور پھر رات گزرتے ہی کمبل میں سارے جسم کو لپیٹ کر بیساکھی کے سہارے گھر سے باہر آ جاتا اور رات گئے تک سنسان گلیوں کے اندھیرے میں شکار کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔ اتفاق ہوا کہ عبداللہ کو کئی روز تک کوئی شکار نہیں ملا۔ اس کی بیوی نے سکینہ بیگم کے گھر ایک مدت سے آمد و رفت بند کر دی تھی لہٰذا دونوں کو مسلسل کئی وقت کے فاقے کرنے پڑے۔ اس رات عبداللہ بڑی بے چینی کے عالم میں اندھیری گلیوں میں منڈلا رہا تھا رات آدھی سے زیادہ گزر گئی مگر کوئی بھولا بھٹکا راہگیر اُس کو نہیں ملا۔ اس کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ اس لیے کہ اب رات کی وہ گھڑی قریب آ رہی تھی جب صرف گشت کرنے والے کانسٹیبلوں کے بھاری بھاری قدموں کی آہٹ سنائی پڑتی اور جن کی نظروں سے بچنے کے لیے اس کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر جب وہ ناامید ہو گیا تو اس نے ایک نئی تجویز سوچی۔ کئی مکانوں کے دروازوں سے کان لگا کر اس نے اندر کی آہٹ لی اور پھر ایک دروازہ پر جا کر آہستہ سے دستک دی لیکن اس وقت وہ خود بھی خوف سے کانپ رہا تھا اس لیے کہ اس دفعہ وہ نیا حربہ آزما رہا تھا۔ جو بے حد خطرناک تھا۔ وہ کرتا بھی کیا۔ اس وقت اس کے علاوہ اور چارہ کار بھی نہ تھا۔

اس نے رک رک کر کئی بار دروازے پر دستک دی۔ ذرا دیر بعد کسی نے اندر سے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کون'' عبداللہ نے آہستہ آہستہ سے کہا۔ ''دروازہ کھولو''

فوراً ہی دروازہ کھل گیا کسی نے اندر سے جھانک کر پوچھا ''کون ہے سامنے آؤ۔'' عبداللہ اندھیرے سے نکل کر ایک دم اس کے سامنے آ گیا اور خوفناک آواز میں بولا۔

''مکھن ٹوش''

اس آدمی کی سٹی گم ہوگئی۔ گلا پھاڑ کر بولا۔ ''باپ رے باپ''

عبداللہ نے اس دفعہ اور بھی بھیانک آواز میں کہا۔ ''مکھن ٹوش''

وہ آدمی یکبارگی چلانے لگا۔ ''بھوت۔ بھوت''

اب سابقہ تجربہ کے پیش نظر عبداللہ کو اب وہاں سے کھسک جانا چاہیے تھا لیکن وہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ دروازے پر کھڑا رہا۔ اس نے سوچا کہ اب تو وہ خوفزدہ ہو ہی چکا ہے ایک وار اور کروں گا تو بے ہوش ہو کر گر ہی پڑے گا۔ اس نے انتہائی خوفناک لہجہ میں حلق سے آواز نکالی۔

''ماکھان ٹوش''

اس آدمی پر عبداللہ کی اس خوفناک آواز کا اثر یہ ہوا کہ وہ اور بھی وحشت ناک طریقے سے چیخنے لگا۔ کمرے کے اندر کچھ اور لوگ بھی سو رہے تھے۔ پہلے تو وہ بیدار ہوئے، ذرا دیر سہمے پڑے رہے پھر سب خوف زدہ ہو کر چیخنے لگے۔

''بھوت۔ بھوت''

اتنی بہت سی آوازوں کا شور سن کر عبداللہ بھی گھبرا گیا۔ وہ فوراً ہی دروازہ پر سے ہٹ آیا اور کسی نہ کسی طرح قبرستان کے پاس والی تنگ گلی میں داخل ہوگیا۔ اب آس پاس کے مکانوں میں بھی لوگ جاگ اٹھے تھے۔ کچھ دروازوں سے نکل کر باہر آ گئے تھے۔ کچھ اُونچی آوازوں میں بول رہے تھے۔ عبداللہ نے دیکھا گلی کے دونوں سروں پر ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔ آگے جانے کے بجائے وہ اندھیرے میں دیوار سے چمٹ کر کھڑا ہوگیا۔ کئی سیکنڈ تک وہ اسی عالم میں کھڑا رہا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اچانک کوئی تیزی سے آ کر اس سے ٹکرایا اور پھر

''بھوت۔ بھوت'' کہتا ہوا سرپٹ بھاگا۔

اس کے بعد ایک بارگی بہت سی ملی جلی آوازیں اُبھریں۔

عبداللہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اچانک ایک پتھر اس کے داہنے کندھے پر آ کر زور سے لگا۔ یہ ابتدا تھی۔ اس کے بعد تو چاروں طرف سے پتھر آ کر گلی میں گرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔

''گلی میں بھوت ہے''

''وہ دیکھو! کچھ نظر آ رہا ہے۔''

اس کے بعد ''بھوت۔ بھوت'' کا نعرہ پھر بلند ہوا اور پتھروں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ پتھر برابر آ کر اس کے جسم پر لگ رہے تھے اور ایک پتھر تو اس زور سے اس کے ماتھے پر لگا کہ وہ چکرا کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت ایک دوسرا پتھر اس کی کن پٹی پر لگا اور عبداللہ نڈھال ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔

قریب ہی ایک بدرو تھا عبداللہ نے سوچا کہ کسی طرح اگر وہ اس میں داخل ہو جائے تو وہ سنگ باری سے بچ جائے گا یہی طے کر کے وہ گھسٹتا ہوا بدر رو کی طرح کھسکنے لگا۔ اچانک ایک بڑا سا پتھر اس کے سر پر آ کر گرا اور عبداللہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ پھر ایک بارگی وہ گلا پھاڑ کر چیخا۔

''ہائے مرا۔''

اس کے بعد عبداللہ کئی بار چیخا کئی بار اس نے التجا کی لیکن دوسری طرف اس قدر شور تھا کہ کوئی اس کی آواز نہ سن سکا۔ پتھر برابر چلتے رہے۔ لوگ گلا پھاڑ کر چیختے رہے وہ اس وقت کرنل کے بھوت کو سنگسار کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح چلا رہے تھے اور گلی کے اندر بے تحاشا پتھر برسا رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں اُن کا شور بڑا خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔

دوسرے دن محلّہ والوں نے دیکھا۔ گلی کے بیچوں بیچ ایک بے حد غلیظ آدمی منہ اوندھائے پڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے جسم کے ہر حصے پر کالا کالا خون بہہ کر جم گیا تھا۔ اس کا چہرہ بدر رو کے اندر تھا اور کیچڑ میں لت پت۔ یہ عبداللہ تھا جو رات ہی کو مر گیا تھا۔

مشق

1. درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

ا۔ ''بُرے کا بُرا انجام'' کے عنوان سے کہانی تحریر کریں۔

ب۔ سکینہ بیگم کے بیٹے کو کیا ہو گیا تھا؟

ج۔ ''مکھن ٹوش'' کا نعرہ کس کا تھا؟

د۔ جب کوئی راہگیر ڈر کر بے ہوش ہو جاتا تو عبداللہ کیا کرتا؟

ہ۔ جب لوگوں نے شام کے بعد گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا تو عبداللہ نے خوراک کے حصول کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا؟

و۔ ''بھوت'' کا سن کر محلے والوں نے کیا کیا؟

ز۔ عبداللہ کی موت کہاں واقع ہوئی؟

2. خالی جگہ درست روزمرہ کے مطابق پُر کریں۔

ا۔ مگر یہ شخص تو ________ کے فرشتے کی طرح نازل ہوا۔

ب۔ میری آواز خوف سے ___کانپ___ رہی تھی؟

ج۔ دونوں مزے سے ___ٹانگیں___ پھیلا کر سوئیں گے۔

د۔ بلی کی طرح ___جھپٹ___ کر میرا گلا دبوچ لیا۔

ہ۔ میری طبیعت اب ذرا ___سنبھل___ چکی تھی۔

3. مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

سنسان، مڈبھیڑ، چوڑا چکلا، امتدادِ زمانہ، سنگسار کرنا، ہُو کا عالم، باچھیں کھلنا

4. درج ذیل الفاظ پر اِعراب لگائیں۔

نوعیت، غنیم، برافروختہ، سناٹا، مڈبھیڑ، بدرو

5. درج ذیل جملے روزمرہ کے مطابق درست کریں۔

ا۔ چور بمع مالِ مسروقہ گرفتار ہو گیا۔

ب۔ عمارت کے اُوپر سرکاری پرچم لہرا رہا ہے۔

ج۔ وادیٔ کاغان کے مناظر تو دیکھنے والے ہیں۔

د۔ مجھ کو سمجھ نہیں آتی کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

ہ۔ مورخہ یکم ستمبر کو میرا کالج کھلے گا۔

6. درج ذیل عبارت میں مناسب مقامات پر رموزِ اوقاف لگائیں۔

سنو بیٹا ملک کو انجینئروں اور ڈاکٹروں کے علاوہ دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی بھی ضرورت ہے اس ملک میں کوئی چوٹی کا مؤرخ ماہر اقتصادیات یگانہء روزگار ادیب یا شاعر بہترین منتظم بین الاقوامی معیار کا قانون دان یا سیاست دان سائنس دان نہیں ہے یہ سب کچھ تو آرٹس کے شعبے سے متعلق ہے۔

افسانہ:

''افسانہ'' کے لیے انگریزی زبان کے الفاظ **Fiction** اور **Short Story** استعمال ہوتے ہیں۔ یہ ناول اور داستان کی نوعیت (قسم) سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر جہاں ناول ایک پورے جہان کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ وہاں افسانہ اس جہانِ انسانی کی زندگی کا صرف ایک پہلو یا معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کا صرف ایک رُخ پیش کرتا ہے۔ پس ہم افسانہ کی تعریف یوں پیش کرتے ہیں:

''افسانہ' ادب کی وہ صنف ہے جو زندگی، کردار یا واقعہ کے کسی ایک پہلو کو مکمل طور پر اس طرح پیش کرتا ہے کہ اسے ایک ہی نشست میں پڑھا جا سکے''۔

یعنی افسانہ وہ مختصر کہانی ہے جسے آدھے گھنٹے سے لے کر ایک یا دو گھنٹے میں پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ کسی شخص کی زندگی کے اہم اور دلچسپ واقعے کو فنی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اس واقعے کے بیان میں ابتدا، عروج اور خاتمہ شامل ہے۔

اشفاق احمد

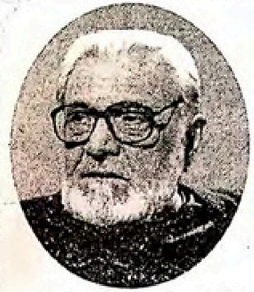

ولادت: ۱۹۲۵ء

وفات: ۲۰۰۴ء

اشفاق احمد اُترپردیش (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی علاقے میں حاصل کی۔ قیامِ پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے وہ ہجرت کر کے لاہور آئے اور مستقل سکونت اختیار کی۔ یہاں اُنھوں نے تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور سے اُردو ادب میں ایم۔اے کیا۔ اُن کی اہلیہ بانو قدسیہ اُردو کی مشہور ناول نگار ہے گورنمنٹ کالج لاہور میں اُن کی ہم جماعت تھیں۔ حصولِ تعلیم کے بعد وہ ریڈیو آزاد کشمیر سے منسلک ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد وہ یہ ملازمت چھوڑ کر لاہور آگئے اور دیال سنگھ کالج لاہور میں اُردو پڑھانے لگے۔ تقریباً دو سال بعد وہ روم چلے گئے اور ریڈیو میں اُردو نیوز کاسٹر مقرر ہوئے ساتھ ساتھ روم کی ایک یونیورسٹی میں اُردو بھی پڑھاتے رہے۔ مختلف ممالک میں قیام کے دوران اُنھوں نے اطالوی اور فرانسیسی زبانوں کے ڈپلومے حاصل کیے جب کہ نیویارک سے ریڈیو براڈکاسٹنگ میں ڈپلومہ حاصل کیا۔

وطن واپسی پر اُنھوں نے اپنا ذاتی رسالہ ''داستان گو'' کے نام سے جاری کیا۔ ساتھ ہی وہ ریڈیو کے لیے فیچرز بھی لکھتے رہے۔ اِسی دوران ان کا مشہور ریڈیو پروگرام ''تلقین شاہ'' نشر ہونا شروع ہوا۔ ہلکے پھلکے انداز میں معاشرتی خامیوں اور تضادات کی نشان دہی کرانے والا یہ پروگرام سامعین میں بے حد مقبول رہا اور تقریباً تیس سال تک نشر ہوتا رہا۔ وہ مرکزی اُردو بورڈ کے ڈائریکٹر بھی رہے (یہ ادارہ آج کل اُردو سائنس بورڈ کہلاتا ہے)۔ اشفاق احمد کچھ عرصے تک وِفاقی وزارتِ تعلیم میں بھی خدمات انجام دیتے رہے۔

اشفاق احمد نے زمانہ طالب علمی سے ہی تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ان کی کہانیاں ''ماہنامہ پھول'' میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اُنھوں نے ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی وژن کے لیے سینکڑوں ڈرامے لکھے۔ ان کے اہم موضوعات ادب، فلسفہ، نفسیات اور صوفی ازم رہے ہیں۔ انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی اور انسان دوستی کی ترویج کی وجہ سے وہ سامعین اور قارئین میں بے حد مقبول رہے ہیں۔

تصانیف: زاویہ، ایک محبت سو افسانے، گڈریا، من چلے کا سودا، حیرت کدہ، سفر در سفر، توتا کہانی، ایک محبت سو ڈرامے وغیرہ۔

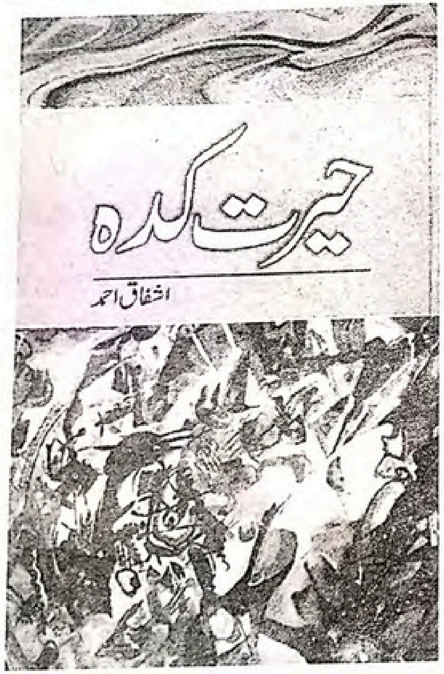

محسن محلّہ

کسی کو ٹھیک سے معلوم نہیں کہ ماسٹر الیاس کب اس محلّہ میں آیا تھا اور کب اس نے یہ کوٹھڑی کرائے پر لی تھی لیکن اس بات کا ہر ایک کو علم تھا کہ ماسٹر الیاس مہاجر ہے اور اس کا تعلق انبالے کے کسی علاقے سے ہے کیونکہ وہ بولی ہی ایسی بولتا ہے جو انبالے میں بولی جاتی ہے۔

ماسٹر الیاس کرائے کی کوٹھڑی میں رہتا ہے اور اس کے پاس محلے کے لڑکے گنتی سیکھنے، پہاڑے کہنے اور تختی لکھنے کے لیے آجاتے تھے۔ اس کے پاس دولڑا کا بٹیر اور ایک اصیل مرغا تھا۔ بٹیر تو پنجروں میں بند رہتے تھے لیکن اصیل مرغا اس کی کوٹھڑی کے دروازے سے ذرا دور کھڑا رہتا تھا۔ ماسٹر الیاس نے مرغے کی ایک ٹانگ میں پیتل کا چھلا ڈال کر اس سے مضبوط ڈور باندھ رکھی تھی اور اس ڈور کا دوسرا سرا اپنی کوٹھڑی کی دہلیز میں میخ ٹھوک کر اس سے باندھ رکھا تھا۔ محسن محلّہ کے سبھی لوگ ماسٹر الیاس کی عزت کرتے تھے اور اس کو السلام علیکم کہہ کر اس کے دروازے کے آگے سے گزرتے تھے۔ ماسٹر جی کچھ اور کام بھی کرتے تھے لیکن کسی کو اس کا علم نہیں تھا۔ شاید وہ سبزی منڈی میں منشی گیری کرتے تھے یا کسی دور کے محلے میں پھیری لگاتے تھے یا کسی کارخانے میں رنگ وروغن کی دہاڑی کرتے تھے۔ کوئی اس کی بابت اچھی طرح سے نہیں جانتا تھا لیکن اتنا سب کو معلوم تھا کہ ماسٹر الیاس کی گزر بسر ذرا تنگی ترشی سے ہی ہوتی ہے۔

دراصل ماسٹر صاحب سیدھے آدمی تھے اور ان کو زمانے کے ساتھ چلنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ کچھ تو ان کی شکل ہی ایسی تھی کہ اسے دیکھ کر لوگوں کے دل میں محبت یا ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا تھا اور کچھ ان کی گفتگو اس انداز کی ہوتی تھی کہ کسی کو اس پر یقین نہیں آتا تھا۔ وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ ہیرا پھیری نہیں کرتے تھے۔ مبالغے سے کام نہیں لیتے تھے۔ شیخی نہیں بگھارتے تھے۔ کسی کو خوفزدہ نہیں کرتے تھے۔ اسی وجہ

NOT FOR SALE

سے کسی کو ان کی بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ ان کی گفتگو میں گرامر کی اور علم بیان کی بہت سے غلطیاں ہوتی تھیں اور سننے والا جھلا کر ان کی صحبت چھوڑ دیتا تھا۔ وہ اتنے سیدھے اور اس قدر بے پیچ تھے کہ انسان ہی نہیں لگتے تھے۔ سارے محلے پر اور ساری سوسائٹی پر ایک بوجھ سا لگتے تھے اور چونکہ ایسے لوگوں کے ساتھ رسم وراہ پیدا کرنا کوئی بھی پسند نہیں کرتا اس لیے کوئی بھی ان کا دوست نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ محلے والے ان کی عزت کرتے تھے اور ان کے دروازے کے آگے سے گزرتے ہوئے السلام علیکم کہہ کر آگے بڑھتے تھے۔

سردیوں کی ایک شام مالکِ مکان نے ماسٹر الیاس کو بڑے سخت الفاظ میں ڈانٹا اور دھمکی دی کہ اگر اس نے تین دن کے اندر اندر پچھلے چھ ماہ کا کرایہ ایک ساتھ ادا نہ کیا تو وہ اس کا سامان نکال کر باہر پھینک دے گا۔ ماسٹر جی کی خوف کے مارے گھگھی بندھ گئی۔ کیونکہ ان کے پاس ایک سو اسی روپے یکمشت موجود نہیں تھے۔ صرف چالیس روپے تھے۔ جن کے ساتھ دس کا ایک نوٹ اور پرو کر انھوں نے پچاس بنا لیے تھے۔ پہلے تو مالک مکان پچیس تیس، چالیس پچاس لے کر آگے کی تاریخ دے دیا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ وہ تڑنگ ہوگیا اور اس نے دھاگے میں پروئے ہوئے پچاس روپے اصیل مرغے کے آگے پھینک کر کہا۔ ’’جا اوئے! میں نہیں لیتا۔ مجھے پورے ایک سو اسی کر کے دے‘‘۔

جب وہ یہ کہہ کر چلا گیا تو ماسٹر الیاس نے پچاس روپے فرش پر سے اٹھا کر اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈال لیے پھر وہ اپنی کوٹھڑی کے اندر جا کر چارپائی پر دُکھی سے ہو کر بیٹھ گئے اور شدید غم کے باعث ان کی گھگھی بندھ گئی اور یہ پہلا موقع تھا کہ روئے بغیر کسی شخص کی گھگھی بندھی ہو!

وعدے کے مطابق مالکِ مکان نے ان کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ ماسٹر صاحب کی چارپائی ٹرانسفارمر والے دو کھمبوں کے پیچھے لگا دی اور ان کا باقی سامان اس کے اردگرد چن دیا۔ اس نے کوٹھڑی کو نیا چینی تالا لگایا اور سکوٹر پر سوار ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔ اس کا گھر اس محلے سے کافی دور تھا اور وہ اپنی کوٹھڑیوں کا کرایہ وصول کرنے ماہ بماہ آیا کرتا تھا۔

NOT FOR SALE

ماسٹر صاحب نے ایک رات جوں توں کر کے ٹرانسفارمر کے نیچے گزاری اور اگلے دن شیخ کریم نواز کی حویلی پہنچ کر اس سے دو سو روپے ادھار کے طلب گار ہوئے۔ شیخ صاحب نے ماسٹر صاحب کو نیک دل، سادہ لوح اور مرنجان مرنج شخص سمجھ کر ٹرخادیا۔ کیونکہ ایسے احمق لوگوں کو زیادہ رقم دینا اچھا نہیں ہوتا۔ پھر وہ اسماعیل بزاز کی دُکان پر گئے اور رقم میں کمی کر کے ڈیڑھ سو کا سوال ڈالا۔ اس نے بھی معذرت کرلی۔ محلے کا کوئی نائی، حلوائی، قصائی، ڈاکٹر، وید، وکیل، ماسٹر صاحب نے نہیں چھوڑا لیکن ہر طرف سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان لوگوں کو شدید مہنگائی نے گھیر رکھا تھا اور ان کے پاس ادھار دینے کو کچھ بھی باقی نہ تھا۔

جس دن ماسٹر الیاس نے ہومیو پیتھک ڈاکٹر کو اپنی نبض دکھائی۔ اس روز اُنھیں ٹرانسفارمر کے نیچے سوتے آٹھواں دن تھا۔ ڈاکٹر نے سٹیتھوسکوپ لگا کر دیکھا اور کہا ماسٹر صاحب نمونیہ ہے میں آپ کو پڑیا تو دے دیتا ہوں لیکن آپ کسی اور کو بھی دکھالیں۔ ماسٹر صاحب نے کہا۔ ''بہت اچھا'' اور گرم دودھ پینے جبار حلوائی کی دُکان پر چلے گئے۔ انھوں نے دودھ پی کر اپنی نبض جبار کو دکھائی اور پھر گڑگڑا کر اس سے دو سو روپے قرض کی درخواست کی۔ جبار ہنس پڑا۔ اس کو پتا تھا کہ ایسے الّو کو کوئی ایک روپیا بھی ادھار نہیں دے سکتا۔ یہ پورے دو سو مانگ رہا ہے جب ایسی انہونی بات ہو، تو ہر ایک کو ہنسی آجاتی ہے اور اسی وجہ سے جبار ہنس پڑا تھا ورنہ عام زندگی میں وہ بہت ہی کم ہنستا تھا۔

مسلسل تین دن تک ماسٹر الیاس اپنی رضائی سر پر اگلو کی طرح اوڑھ کر چارپائی پر بیٹھے رہے جو کوئی وہاں سے گزرتا ''السلام علیکم'' کہہ کر یہ ضرور پوچھتا۔ ''کیوں جی ماسٹر جی، دھوپ سینکی جارہی ہے'' اور ماسٹر جی اندر سے بند آواز میں جواب دیتے۔ ''ہاں جی تھوڑی سردی لگ رہی تھی''۔

چوتھے روز فجر کی اذان کے وقت جب ماسٹر صاحب فوت ہوگئے تو محسن محلّہ کے ایک ایک شخص کو ان کی موت کا بڑا صدمہ ہوا۔ ناشتہ کا وقت ختم ہونے تک ہر شخص خاموشی اور دکھ کے کوئے میں لپٹ کر دھوپ میں جا کھڑا ہوا۔ ماسٹر جی کے بٹیروں کو کٹورہ بھر کنگنی اور ان کے مرغے کو آٹے کی آب خورہ بھر گولیاں ڈال دی گئیں۔ شیخ کریم نواز صاحب اپنی حویلی سے نکل کر ٹرانسفارمر کے نیچے آبیٹھے۔ یہاں لوگوں نے بڑی سی

دری بچھادی اور دو تین تازہ اخبار لا کر رکھ دیے۔ لوگ جمع ہونے شروع ہوئے۔ شیخ کریم نواز نے دو سو روپے نکال کر سعید اور بلال کو سکوٹر پر بھیجا کہ جا کر قبر کا بندوبست کریں۔ تین سو روپے بابو جلال کو دیے کہ رحمت کو ساتھ لے جا کر لٹھے، کافور، عرق گلاب اور پھولوں کا بندوبست کریں۔ جبار حلوائی نے دودھ پتی کا ایک پتیلا کاڑھ کر صف پر پہنچادیا۔ لوگوں نے ماسٹر صاحب کی رسم قل کے لیے پیسے جمع کرنے شروع کیے اور دیکھتے دیکھتے محسن محلّہ کے لوگوں نے آٹھ سو گیارہ روپے جمع کر کے شیخ کریم نواز صاحب کے پاس محفوظ کرادیے۔

مشق

۱۔ سوالات کے جوابات لکھیں۔

(ا) محسن محلّہ کے لوگ ماسٹر صاحب کے بارے میں کیا جانتے تھے؟

(ب) ماسٹر صاحب کس طرح کے آدمی تھے؟

(ج) لوگ ماسٹر صاحب سے دوستی کرنا کیوں پسند نہیں کرتے تھے؟

(د) مالک مکان نے ماسٹر صاحب سے کیا سلوک کیا؟

(ہ) ماسٹر صاحب کے مرنے کے بعد لوگوں نے کیا طرزِ عمل اپنایا؟

(و) ماسٹر صاحِب کا کیا انجام ہوا؟

(ز) اس افسانے کا مرکزی خیال لکھیں۔

۲۔ خالی جگہ پُر کریں:

(ا) ان کو زمانے کے ساتھ چلنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔

(ب) خوف کے مارے اس کی گھگی بندھ گئی۔

(ج) وہ سردی کے موسم میں باہر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔

(د) شیخی بگھارنا اچھی بات نہیں۔

(و) مالک مکان نے کرایا دار کو سخت الفاظ میں ڈانٹا۔

۳۔ سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل عبارتوں کی تشریح کریں:

(ا) وہ اتنے سیدھے اور اس قدر بے پیچ تھے کہ انسان ہی نہیں لگتے تھے۔ سارے محلے پر اور ساری سوسائٹی پر ایک بوجھ سا لگتے تھے اور چونکہ ایسے لوگوں کے ساتھ رسم وراہ پیدا کرنا کوئی بھی پسند نہیں کرتا اس لیے کوئی بھی ان کا دوست نہیں تھا۔

(ب) مسلسل تین دن تک ماسٹر الیاس اپنی رضائی سر پر اگلو کی طرح اوڑھ کر چارپائی پر بیٹھے رہے جو کوئی وہاں سے گزرتا "السلام علیکم" کہہ کر یہ ضرور پوچھتا۔ "کیوں جی ماسٹر جی دھوپ سینکی جارہی ہے" اور ماسٹر جی اندر سے بند آواز میں جواب دیتے۔ "ہاں جی تھوڑی سردی لگ رہی تھی"۔

۴۔ روزمرّہ کے مطابق خالی جگہ پُر کریں:

(الف) وہ غصے سے دانت پیستا ہوا آگے بڑھا۔

(ب) جب اُس نے پاکستان کی جیت کی خبر سنی تو خوشی سے پاگل ہو گیا۔

(ج) تمھارے منہ میں خاک، کیسی منحوس باتیں کر رہے ہو۔

(د) تم تو ہاتھ جھاڑ کر میرے بچے کے پیچھے پڑ گئے ہو۔

(ہ) میں یہ خوفناک منظر نہ دیکھ سکا اور ڈر کے مارے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

۵۔ جملے درست کریں:

(الف) ہمارا وطن دن بدلن ترقی کر رہا ہے۔

(ب) وہ حیرانگی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

(ج) میرا بڑا دل کرتا ہے کہ حج پر جاؤں۔

(د) میں آپ سے ایک ضروری بات کہنے آیا ہوں۔

(ہ) اس کی چیخ و پکار سن کر لوگ مدد کے لیے دوڑے۔ دوڑ پڑے

۶۔ درج ذیل جملوں میں مناسب مقامات پر رموزِ اوقاف لگائیں:

(الف) اسے جب دیکھو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے

(ب) اس مضمون کے اہم نکات یہ ہیں :۔

(ج) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "سب انسان برابر ہیں"

(د) لڑکے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟

(ہ) "دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا" احمد فراز کا یہ مصرع حقیقت پر مبنی ہے۔

۷۔ اُردو میں درج ذیل افعال بطور معاون افعال استعمال کیے جاتے ہیں۔ آپ ان کی مدد سے دو دو جملے بنائیں۔ جن میں یہ بطور امدادی یا معاون فعل استعمال ہوں۔

دینا۔ لینا۔ آنا۔ ڈالنا۔ جانا۔ پڑنا ۔ اُٹھنا۔

(1) بچوں کو یہاں سے نکال دینا پڑے گا۔

(2) بچے کے کافی بڑا انعام لینا خوشی کی بات ہے۔

الطاف فاطمہ

ولادت: ۱۹۲۹ء

الطاف فاطمہ لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی اور قیامِ پاکستان کے بعد اپنے خاندان سمیت لاہور میں مستقل رہائش اختیار کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے، بی۔ایڈ کرنے کے بعد درس و تدریس سے وابستہ ہو گئیں۔ اسلامیہ کالج برائے خواتین اور اپوا گرلز کالج میں اُردو ادب پڑھاتی رہیں۔ وہ ملازمت سے ریٹائر ہو چکی ہیں اور آج کل لاہور ہی میں مقیم ہیں۔

لاہور میں رہائش اور زندگی کا ایک طویل عرصہ گزارنے کے باوجود وہ ہر طرح کی ادبی مجالس، اداروں اور تحریکوں سے لاتعلق رہیں۔ اُن کے افسانے حقیقت کے ترجمان ہیں انھوں نے مشرقی عورت کی نفسیات کی ترجمانی کی ہے۔ اُنھوں نے عام معاشرتی مسائل پر قلم اُٹھایا ہے اور اُن کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتی ہیں۔

وفات: 2018ء

تصانیف: نشانِ محفل، دستک نہ دو، چلتا مسافر (ناول)۔ وہ جسے چاہا گیا، جب دیواریں گریہ کرتی ہیں، تارِ عنکبوت (افسانے)۔

کنڈکٹر

اب تو یہ سننے میں آتا ہے کہ اس نے کراچی میں کوئی اچھا بزنس جما لیا اور ایک اچھا معقول بنگلہ بنا لیا ہے۔

ایک مرتبہ بہت عرصہ پہلے یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ ایک سکول ٹیچر سے شادی کر لی ہے، جس پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ اچھا، کوئی ایسی بھی حوصلے والی ہو سکتی ہے جس نے نہ صرف ایک انڈر میٹرک کی شریکِ حیات بننا قبول کیا بلکہ ایک عرصے تک اس کی زندگی کی چھکڑا گاڑی کا ایک مضبوط پہیا بلکہ اسٹیرنگ بن کر بڑی ہمواری سے چلنے میں مدد دیتی رہی اور یہ سن کر خوشی ہوئی کہ چلو اب تو وہ بھی چین سے بیٹھی ہوگی۔

دراصل لالو کا کیا، کسی کا بھی حال ایسا خطِ مستقیم نہیں کہ جس پر سفر کر کے کوئی ناک کی سیدھ میں سفر کرتا جائے۔

زندگی تو ایک دلچسپ بھول بھلیاں ہے جس میں بے شمار دائرے، بند راستے اور کئی الجھے ہوئے خطوط آتے ہیں اور اپنی راہ کی تلاش میں کوئی اِن الجھے ہوئے خطوط کو کیونکر سلجھاتا ہے اور اپنی راہ کا کھوج لگاتا ہے، یہ ہر شخص کا اپنا مسئلہ ہے۔

لالو کا مسئلہ بھی ایسا ہی تھا۔ وہ اپنے گھرانے کا دوسرا بیٹا تھا اور اگر آپ تصور میں سید اور مغل خون کی آمیزش کی ایک تصویر بنا سکتے ہیں تو بنا لیجیے ورنہ میں تو یہ کام کرنے سے رہی کہ اس کی اس وقت اور آج کی تصویر میں بہت فرق پڑ گیا ہے۔ اُس وقت یعنی جب وہ پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس کی تعلیمی رفتار سست اور مایوس کن تھی، اُس کے خدوخال پر ہر حماقت کی چھاپ کسی دوسری کیفیت سے زیادہ نمایاں تھی اور اس پر تتلاہٹ۔ وہ بھی ایسی کہ کاف کو ٹاف اور گاف کو ڈاف کہتا۔ اس نے اپنی پوری کنگ ریڈر اسی انداز

میں رٹ رکھی تھی اور ہمارے مشترک ٹیوٹر یعنی ماسٹر صاحب کا کہنا تھا کہ خبیث کو ایک لفظ نہیں آتا اور یہ اس نے صرف رٹ رٹا لیا ہے کہ وقتِ ضرورت کام آسکے۔

لالو کا خاندان ہمارے چھوٹے سے گھر میں مقیم تھا۔ اس کا دروازہ ہمارے صحن میں کھلتا تھا۔ وہ اور اس کا بھائی دونوں ہمارے ہی کمرے میں ساتھ بیٹھ کر ماسٹر صاحب سے پڑھتے جو لالُو سے حد درجہ مایوس تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ تم خاک پڑھو گے تمھاری ڈوڈ ٹبھی(۱) ٹھالی رہے تو تم پڑھو اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کے کولہے پر سدا ایک نہ ایک چھوٹا بچہ لدا رہتا کہ اس کی والدہ نے اس کا یہی مقدر تجویز کیا تھا۔

ماسٹر صاحب اس کے بَیری نہ تھے۔ بہی خواہ تھے، جبھی تو اس کے کان نوچتے، ہاتھوں پر سٹیاں مارتے اور صلواتیں سناتے، ارے! تم کیا پڑھو گے؟ گھاس کھودو گے۔ تم تو بہن بھائیوں کی چاکری کرو گے! بَیرا بنو گے۔''

اور اس پر اس نے کبھی کسی ردِعمل کا اظہار نہ کیا۔ سر جھکائے نیچی نظریں کیے یوں بیٹھا رہتا گویا ماسٹر صاحب کی پیش گوئیوں سے اسے سولہ آنے اتفاق ہو۔

البتہ جب یہی الفاظ اس کی ماں کی زبان سے نکلتے، تو وہ طنزیہ مسکراتا، کنکھیوں سے دیکھتا، چہرے پر کرب و بے بسی سے زیادہ ایک پُر اَسرار سی تمتماہٹ، جیسے اس کا خون جوش مار رہا ہو اور اس کے اندر کوئی اَسرار پل رہا ہو۔

چھوٹے بھائی بہنوں کی نگہداشت کرتے کرتے اس کا دل پڑھائی سے واقعی اچاٹ تھا بادی النظر میں وہ نکھٹو اور پڑھائی سے دل چُرانے والا تھا۔

اور ہم لوگ اپنی برتری جتانے کے لیے اس کا مذاق اڑاتے۔ مگر وہ .... وہ صرف ہمیں گھور کر دیکھتا اور کچھ نہ کہتا۔ ہمیں کیا معلوم تھا وہ اپنے اندر ایک بہت بڑے راز کی تلاش اور جستجو میں ہے اور ایک زبردست اَسرار نما حقیقت کے حوالے سے خود اپنا سُراغ لگا رہا ہے۔

---

(۱) گود کبھی خالی

کبھی کبھی میں اپنی فوقیت کے احساس کی ترنگ میں آکر اپنی عمر کی بڑائی کے ساتھ ساتھ جماعتوں کی برتری جتاتی اور اس کو سمجھانے کی کوشش کرتی:

دیکھو، لالو! تم بھی محنت سے پڑھ لیا کرو۔ ماسٹر صاحب تمھارے بھلے کو کہتے ہیں..................''۔ وہ بات کاٹ دیتا۔'' محنت سے آپ لوگ پڑھو۔ ہمارا کیا ہے، ہم ٹو بڈھے ٹوٹے ہیں۔ مجھے معلوم ہے میں اپنی عمر کے لحاظ سے بہت پیچھے ہوں''۔ پھر وہ الٹا ہمارا مذاق اڑانا شروع کر دیتا۔

ٹھیلوڈے ٹو دوڈے تو بنوڈے نواب(۱)
پڑھوڈے لِٹھوڈے تو ہوڈے ٹھراب

اور ان خراب ہونے والوں میں اس کے دو سال بڑے بھائی کی ذات بھی شامل ہوتی، جو آٹھویں جماعت میں ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا۔

میں اس کی بات خاک جھٹلاتی، اس لیے کہ واقعی خراب تو ہم ہو رہے تھے کہ گرما کے طویل دن برساتوں اور پھر سرما کے مختصر دنوں میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ ہر آنے والا نیا دن وقت کی دہلیز پر گرز مار کر کہتا:

امتحان! امتحان! امتحان!

ہم سکڑتے اور سمٹتے جاتے تھے۔

پچھواڑے شاہ گنج کی گلی میں دھوبی ٹھلیا اور چمٹا بجا کر کبیرؔ اور تلسیؔ کے دوہے گاتے، تو ہم کان لگا کر نہ سن سکتے کہ ہمارے سامنے ایشیا اور اس کی وسیع چراگاہوں کے نقشے پھیلے ہوئے ہیں۔ پھر پانی پت اور دکن کے میدانوں میں رن پڑے ہوا کرتے اور ہم ایسٹ انڈیا کمپنی، لارڈ کلائیو اور کارنوالس کے ہم قدم تاریخ کی شاہراہ پر چہل قدمی کر رہے ہوتے۔ زندگی میں کون سا موسم ایسا نہیں آتا کہ جب فضا میں جلترنگ

---

(۱) کھیلو گے کودو گے تو بنو گے نواب
پڑھو گے لکھو گے تو ہو گے خراب

نہ بج رہے ہوں، فاختائیں نہ کوکتی ہوں، الغوزوں اور بانسری کی تانیں نہ لہراتی ہوں، مگر امتحان۔ امتحان تو
ہمیں اعشاری کسور، سودی نظام اور A+B کے چکر سے نکلنے ہی نہ دیتے۔
وقت اور زمانے سے ہمارے رابطے ٹوٹ رہے تھے البتہ لالو، لالو کی بات اور تھی۔ گود کا بچہ سو رہا ہوتا
تو خود اس کے نزدیک زندگی کا کوئی مقصد نہ رہتا۔ بڑی الکسی سے انگلیاں چٹخاتا اور دانت بھینچ کر گنگنایا کرتا۔

زندگی ہے پیار سے، پیار میں بتائے جا

وہ واقعی زندگی اور دھرتی کے رنگوں سے پیار کرتا، نیلے آسمان اور قوسِ قزح سے رابطہ قائم رکھتا۔
اسے پتا ہوتا، آسمان پر کالی ٹانگوں اور سفید پروں والے بگلوں کی قطار میں آج کتنے بگلے تھے، آنگن میں کتنی
لم ڈوریں اور گول گول آنکھوں والی ڈومن چڑیاں اتریں۔
اکتاہٹ بڑھتی تو وہ پتنگیں لوٹنے نکل جاتا یا پھر ڈربے میں سے پٹھورے کھینچ کھینچ کر سب سے قوی
اور جیدمرغ سے لڑانے لگتا۔
ہم اس کو اپنی انکھیوں میں رکھتے۔
جبھی تو ہم نے اس کے اندر ایک واضح فرق محسوس کیا۔ گردن اٹھا کر چلتا، وقار سے اپنی بات
منواتا اور جب بڑے لوگ واقعاتِ عالم پر بات کرتے، تو بڑے اعتماد سے اپنے ٹاف ڈاف والے لہجے میں
لقمے دیتا۔

اب میں سوچتی ہوں اس نے اپنی منزل اور سراغ پالیا تھا، کسی بڑے اَسرار کے حوالے سے، جب
ہی تو اکثر وہ کسی گہری سوچ میں بیٹھا انگلیاں چٹخایا کرتا یا پھر کسی درخت کے سائے تلے چارپائی پر لیٹا، نیم وا
آنکھوں سے نیلے آسمان کو تکتا رہتا۔

5-6-2005

ہم سمجھتے تھے کہ یہ بیکاری سے اکتا رہا ہے۔
کسے خبر تھی کہ وہ انتظار کر رہا ہے۔
چند ہفتوں سے وہ بیٹھے بیٹھے غائب ہو جاتا اور پھر گھنٹوں واپس نہ آتا۔

اس کی والدہ بیٹھی اس کو کوستی کاٹتی رہتی اور اس پُراسراریت کا کھوج لگانے کی فکر میں رہتی۔ سرما کے کچھ اور دن چپکے سے سرک لیے تھے اور اب فضا میں عجب سی آوازیں کانوں سے ٹکرانے لگیں: نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر! پاکستان، زندہ باد، لے کے رہیں گے پاکستان۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ، زندہ باد! پھر کوئی منچلا سریلی آواز میں لہکتا:

"ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناحؒ"

یہ صدائیں سن سن کر ہماری والدہ آبدیدہ ہو جاتیں۔ کبھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتیں اور کبھی آسمان کو دیکھنے لگتیں، بالکل لالو کی طرح مجھے یہ بھی یاد ہے کہ نعرے سن کر بہت سے لوگ آبدیدہ ہوتے اور کچھ لوگ ہنس دیتے۔

یہ صدائیں ہمارے لیے نئی تھیں، اس لیے کہ ہمارے علاقوں میں ارتھیوں، جنازوں اور باراتوں کے جلوسوں کے سوا کسی دوسرے جلوس کا رواج نہ تھا۔ ہمارے باورچی خانے کی کھڑکی گلی میں کھلتی تھی۔ کوئی جلوس گزرتا تو ہم سب بیک وقت کھڑکی میں ٹھنس کر بیٹھ جاتے اور نظارہ کرتے۔

ان نعروں اور جلوسوں میں عجیب طرح کی کشش تھی کہ ہم امتحان کی ہیبت کے باوجود کتابیں کاپیاں چھوڑ چھاڑ کھڑکی کی طرف لپک لیتے۔

جب ہی ہم چاند تارے والے پرچم سے آشنا ہوئے، جب ہی پاکستان کا نام سنا۔

"ارے، عجیب بات ہے! پاکستان ہے کہاں جو زندہ باد ہو؟"

لالو کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔

"ہے کیوں نہیں! بالکل ہے۔ یہاں ہے، یہاں"! اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"تم، !لالو! تمھارے اندر............" ہم نے حیرت سے دیکھا۔

"ہاں............" اس نے کہا۔ کھڑکی سے باہر چھلانگ لگائی اور جلوس میں شریک ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے ہم سب پر برتری حاصل ہو چکی تھی۔ وہ بہت کچھ جانتا اور سمجھتا تھا۔

اور ہم! ہم تو بقول اس کے "ٹھراپ" ہو رہے تھے۔

"A IS EQUAL TO X" کے پھیر سے نکلے، تو پلاسی اور سرنگا پٹم کے میدانوں میں اپنی شکست کے اسباب ڈھونڈنے جا کھڑے ہوئے۔ اب ایسے میں ہمیں کیا پتہ چلتا کہ شملہ کانفرنس ہو کس شہر میں رہی ہے، لارڈ ویول اچانک کب اور کیوں رخصت ہوا اور برطانوی راج کا انیسواں خوبرو وائسرائے لوئی ماؤنٹ بیٹن کس مقصد اور غرض سے تشریف لایا۔؟

کون سا وقت آرہا ہے، کون سا لمحہ جا رہا ہے۔

آدھی رات کا گجر، چوکیدار کی "جاگتے رہو، خبردار" مسجدوں کی اذان کا سحر، مندروں کی گھنٹیوں کی باج ہمیں تو ایک بہت چھوٹے سے امتحان کی خبر دیتی۔

ایک رات اور بیتی، ایک سحر اور طلوع ہوئی۔ امتحان ایک دن اور قریب ہوا۔ مگر لالو...............اس کے تو دل کی ہر دھڑکن اس کو ایک بڑا امتحان، ایک بڑی آزمائش کی خبر دیتی تھی، جب ہی تو ہمارے چہروں پر دہشت کی پھٹکار تھی اور اس کے چہرے پر طمانیت کا وہ نور کہ نورِ سحر کو شرما دے۔

وہ اب اکثر سکول نہ جاتا۔ رستے ہی سے غائب ہو جاتا۔ اس کا بھائی کہتا: "اماں سے نہ کہنا۔ یہ اب مسلم لیگ کے دفتر پہنچ جاتا ہے۔ ماریں گی اسے"۔

تو گویا رفتہ رفتہ وہ بھی سازش میں شریک ہو رہے تھے۔ مجھے وہ دن کبھی نہ بھولے گا جب لالو اور اس کا بھائی صبح نکلے اور دوسری صبح تک نہ پہنچے۔

تمام رات ان کی اماں روتی رہیں۔

"ارے میرے دونوں مٹ گئے، اب تو لاشیں ہی آئیں گی"۔ تمام رات ہماری والدہ انھیں تسلیاں دیتی رہیں۔ چہرہ اُن کا بھی فق تھا۔ ہمیں بھی یہ رنج کھائے جاتا تھا، کاہے کو اسے چھیڑتے تھے۔

(3) دن چڑھا، تو ماسٹر صاحب پڑھانے آئے۔ ہم نے ہونق صورتوں کے ساتھ لالو اور اس کے بھائی کی گمشدگی کی خبر سنائی، اور وہ الٹے قدموں لوٹ گئے۔ چار بجے ماسٹر صاحب اس شان سے نمودار ہوئے کہ ایک

ہاتھ ایک کی، دوسرا دوسرے کی گردن پر۔ (دونوں کو اپنے ماں کے حوالے کیا۔)

"یہ لیجیے یہ آپ کے صاحبزادگان لیڈری فرما رہے تھے اور پاکستان بنا رہے تھے"۔

"اے ماسٹر صاحب! آپ ہی نے تو ان کے سروں میں یہ خناس بھر دیا ہے، خود ہی تو پٹیاں پڑھائی ہیں۔ ارے، اب یہ گئے دونوں امتحان سے"۔ وہ اُلٹا ماسٹر صاحب کے سر ہوگئیں۔

ماسٹر صاحب بوکھلا کر بولے:

"ارے اب یہ تھوڑی کہا تھا کہ عین امتحان کے نزدیک تم جلوس میں لگ جاؤ۔ اب جو دیکھتے ہیں، تو کیا نظر آیا کہ لیاقت علی خان کا جلوس رواں ہے اور یہ مغلیہ شہزادے ہاتھیوں پر سوار گلے میں ہار نعرے پر نعرہ لگا رہے تھے"۔

اور اب ان کی والدہ اور جوش میں آگئیں۔

"ماسٹر صاحب، آپ کو خدا کی قسم! انھیں اتنا ماریے کہ ان کی ساری لیڈری ناک سے نکل جائے۔ ان کی جان نکل جائے"۔

لالو نے ایک باغیانہ نظر ڈالی: "لیڈری نکل جائے، جان نکل جائے، پاقستان نہیں نکل سکتا"۔

اور یہ ایک بڑی اہم تبدیلی تھی۔ لالو پاٹستان کے بجائے پاقستان کہہ رہا تھا۔

مجھے کبھی نہ بھولے گا، ماسٹر صاحب نے دونوں کو لٹا لٹا کر مارا اور ہم سب کو حکم دیا: "چلو کم بختو، اپنی کتابیں نکالو"۔

جتنی دیر انھوں نے پڑھایا لالو کے کان مسوس مسوس کر ہم سب کو لیکچر دیتے رہے۔

"ارے، تو کیا تم جاہلوں کے لیے بنے گا پاکستان؟ تم پاکستان کے قابل تو ہو"۔

وہ چلے گئے، تو میں نے لالو کو قائل کرنا چاہا:

"ٹھیک ہی تو کہتے ہیں"۔

پھر اس نے لکھنا شروع کیا: پاؤل ہو تم بھی ان ہی ٹی ٹرح۔ اب امٹحانوں ٹا وٹٹ نہیں۔" ماریں

نے مرجائیں نے، پاقستان بنائیں نے"۔

غرض اب وہ کھل کر سامنے آگیا۔ دیوانہ وار کہہ سن کر مسلم لیگ کے دفتر جاتا، شہر کی دیواروں پر پوسٹر چپکاتا۔ اب تو اس کے گیتوں کے بول بھی بدل گئے تھے۔ لہک کر کہتا:

ایسی تڑی ٹماں ہے محمد علی جناح"

جب اس کی والدہ نے اس کو تنبیہ کرنے کی فرمائش اس کے والد سے کی، تو وہ ہنس کر بولے:

"بیگم اب ہم کس کس کو روکیں گے؟ یہ تو وقت کی آواز ہے، زبانِ خلق ہے۔ ارے تم تو اندر گھر میں بیٹھی ہو، ہم سے پوچھو ملازمت کی وجہ سے اپنے آپ کو کس کس طرح روکتے ہیں"۔

لالو اب بھی تتلاتا تھا، لیکن پاکستان اور قائداعظمؒ دو لفظ ایسے تھے جن کا صحیح تلفظ بڑی مشقت سے کرتا تھا۔ یہی اس کا نذرانہ عقیدت تھا۔

امتحان بھی ختم ہولیے، تو بدلتی رُتوں کا پھر سے احساس ہوا۔ ساری فضا اور ماحول میں ایک عجیب سی کیفیت بڑھ رہی تھی جیسے ماحول کو بھی لالو کی طرح کسی بات کا انتظار ہو۔

پھر وہ رات گزری۔ مرغِ سحر بولا۔ مسجد کے مناروں سے جانی پہچانی صدا ایک نئے لحن سے گونجی:

"اللہ اکبر!"

یہی وہ صبح تھی جب ہم نے وہ نئی خبر سنی۔

بھئی، مبارک! ہر شخص لالو کو مبارک باد دے رہا تھا اور وہ سچے فاتح کی طرح سر اُٹھائے نہیں، سر جھکائے کھڑا تھا۔ سب حیران تھے۔ سب چہک رہے تھے۔ سب اکسائیٹڈ تھے، بجز لالو کے جو پہلے ہی جانتا تھا کہ یہ دن آئے گا۔

چودہ اگست ۱۹۴۷ء کی اِس صبح مجھے نئی تاریخ سے بالکل ہیبت نہ آئی کہ لو اور مواد بڑھ گیا رئے انے کو۔ مجھے تو عجیب سا احساس ہو رہا تھا جیسے بہت اُوپر سے کوئی گاتی گنگناتی آبشار آ رہی ہو کہ اچانک سمندر نے اپنا رُخ بدلا اور آبشار کے نیچے سے موجیں مارتا، شور مچاتا آگے بڑھنے لگا ہو۔

ہم پاکستان ۱۹۴۷ء میں آئے۔

لالو کی کوئی خبر ہی نہ ملی۔

البتہ ہر اگست کی چودہ تاریخ کو اس کا خیال ضرور آتا۔

"لے ٹے رہیں گے پاقستان

بن ٹے رہے گا پاقستان"۔

پھر ایک شادی میں کراچی جانا ہوا، تو ڈھوپ ڈھمکوں کے درمیان ہم شادی کے گانوں میں مصروف تھے کہ کسی بچے نے آ کر کہا: "آپ کو کچھ لوگ باہر بلا رہے ہیں"۔

"کون لوگ ہیں"؟

میں حیران ہوتی شامیانے میں آئی۔ ایک صف میں بچھی کرسیوں پر نوجوان لڑکوں کی قطار بجی تھی۔ ہم سبق، ہم جولی، کرکٹ اور ہاکیوں کے ساتھ سب ہی "ہمیں پہچانا، ہمیں پہچانا" کہہ کر کھڑے ہوگئے۔

"ارے بھائی، ہر چیز اتنی بدل گئی۔ کس کس کو پہچانیں" میں ہنس پڑی۔ ان میں لالو بھی تھا۔

"مجھے بھی پہچانا؟"

میں نے پہچاننے کی کوشش کی۔

"وہ لیاقت علی خان کا جلوس۔ ماسٹر صاحب یا پٹائی۔ کچھ یاد نہیں؟"

"ارے لالو تم! تم"۔ پھر میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا: "آج کل تم کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو"؟

"میں بس کا کنڈکٹر ہوں"۔

"مذاق کرتے ہو"۔

"بالکل نہیں۔ بھائی اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ یہ ہمارا پاکستان جو ہے نا، یہ ایک بڑی سی بس ہی تو

ہے۔ہم سب جو کچھ بھی کریں، اس کے کنڈکٹر ہی تو ہیں۔ بس یہی خیال رکھنا ہے کہ گاڑی چلتی رہے"۔
ہے۔ہم سب جو کچھ بھی کریں، اس کے کنڈکٹر ہی تو ہیں۔ ارے اُس وقت بھی ہمارے حلقے کی ایک تم ہی تو نمائندگی
"بڑی زبردست بات کہہ دی تم نے۔ ارے اُس وقت بھی ہمارے حلقے کی ایک تم ہی تو نمائندگی
کر رہے تھے۔ ہم سب تو خراب ہو رہے تھے۔
بڑی دیر تک ہم قہقہے لگا لگا کر ماضی کی باتیں کرتے رہے۔ کراچی جانا ہی نہیں ہوتا۔ کئی کئی سال بس
خبریں ملتی ہیں۔ لالُو کی ایک خبر ملی کہ پہلے نائٹ سکول، پھر کالج جوائن کرلیا ہے، ایک ٹیچر سے بیاہ رچالیا ہے۔
اور اب یہ خبر ملی کہ گھر بنالیا ہے۔ تو میں سوچ رہی ہوں کہ اس کا گھر تو کب کا بن گیا تھا۔ چودہ اگست ۱۹۴۷ء
کو کہ وہ ایک بلندی پر کھڑا تھا۔ ایک گاتی گنگناتی آبشار تھی کہ نیچے کو آئی تھی اور مؤاج سمندر تھا کہ اس کے
قدموں میں پہنچا تھا، اس کے چھوٹے چھوٹے تاریخ ساز قدموں میں۔ اور اب؟ اب تو ہم سب ایک بڑی سی
بس میں سفر کر رہے ہیں جس کے ہر دروازے پر اس کا ہم شکل کنڈکٹر مستعدی سے کھڑا ہے۔
سمندر، آبشار اور چلتی بس کی آوازوں کے درمیان کتنا سکون ہے اور کتنی کشش!

(تارِ عنکبوت)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات لکھیں:

(الف) لالُو کے بارے میں ماسٹر صاحب کیا کہتے تھے؟

(ب) لالُو گھر سے غائب ہو کر کہاں جاتا تھا؟

(ج) ماسٹر صاحب لالُو اور اُس کے بھائی کو کہاں سے پکڑ کر لائے تھے؟

(د) قیامِ پاکستان کے بعد لالو نے اپنی زندگی کیسے گزاری؟

(ہ) لالُو کی سرگرمیوں پر لالو کے والد نے کن خیالات کا اظہار کیا؟

(و) لارڈ ماؤنٹ بیٹن کون تھے؟

۲۔ خالی جگہ پُر کریں:

(الف) اب تو اُس نے کراچی میں .... جمالیا

(ب) لالو کے خدو خال پر .... کی گہری چھاپ نمایاں تھی۔

(ج) ہم لوگ اپنی .... جتانے کے لیے لالو کا مذاق اُڑاتے۔

(د) اِن نعروں اور جلوسوں میں عجیب سی .... تھی۔

(ہ) اب وہ دیوانہ وار .... کے دفتر جاتا

۳۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

(۱) اب ہم پلاسی اور سرنگا پٹم کے میدانوں میں اپنی شکست کے اسباب ڈھونڈ رہے تھے۔

(۲) اب ہم کس کس کو روکیں گے؟ یہ تو وقت کی آواز ہے، زبانِ خلق ہے۔

(۳) کسے خبر تھی کہ وہ انتظار کر رہا ہے۔

۴۔ لالُو اپنی تعلیم اور امتحانوں کو چھوڑ کر جلسے جلوسوں میں شریک ہوتا۔ کیا اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا کر اُس کا یوں جلسے جلوسوں میں جانا درست تھا؟

۵۔ استدراکی اور سببی جملوں کی تمام اقسام کی دو دو مثالیں لکھیں۔ *

۶۔ درج ذیل جملوں میں معاون افعال کی نشان دہی کریں:

ا۔ ابرار معاشرے میں اپنا وقار کھو بیٹھا۔

ب۔ ہجوم میں تو میرا دم گھٹنے لگا تھا۔

ج۔ کاش تم میچ جیت سکو۔

د۔ تمام طلبہ یک زبان بول اُٹھے۔

ہ۔ تھانیدار ملزم پر برس پڑا۔

* مرکّب جملے:

استدراکی جملے:
اس میں عموماً دو جملوں کا باہم مقابلہ کیا جاتا ہے۔اس طرح کے جملوں میں مگر، لیکن،اور، پر، بلکہ، سو وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔اس کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) دوسرا جملہ پہلے جملے کے خلاف یا اس کی نفی کرے مثلاً:

وہ ترقی کرتے ہوئے کہاں جا پہنچا مگر میں وہیں کا وہیں ہوں۔

اتنا بڑا عالم اور اس قدر سنگ دِل

- بعض اوقات اس طرح کے جملے ”اگرچہ“ سے شروع ہوتے ہیں ۔جیسے:

اگرچہ اُس نے مجھے نظر انداز کیا تھا لیکن میں اُس کی مدد کروں گا۔

(۲) دوسرا جملہ پہلے جملے کو محدود یا مقید کرے۔جیسے:

وہ وعدے تو کرتا ہے لیکن یاد نہیں رکھتا۔

وہ دوست تو ہے پر مصیبت کا ساتھی نہیں۔

(۳) دوسرا بیان پہلے بیان کی توسیع یا تصدیق کرے۔جیسے:

اُس نے صرف خود غرضی ہی نہیں کی بلکہ طرح طرح کی تکالیف بھی پہنچائیں ۔

سببی جملے:

اِن جملوں میں دوسرا جملہ پہلے جملے کی وجہ سبب یا نتیجے کو ظاہر کرے۔ان جملوں سے پہلے کیوں کہ، اس لیے، اس واسطے، لہٰذا، پس وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔

(i) وہ بہت بدتمیز ہے اس لیے میں اُس سے زیادہ بات چیت نہیں کرتا۔

(ii) مجھے اُس کی بات کا یقین ہے کیوں کہ وہ سچا ہے۔

(iii) بعض اوقات اس طرح کے جملوں سے پہلے لفظ ”چونکہ“ کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ مثلاً:

(iv) چونکہ وہ حق پر ہے اس لیے میں اُس کا ساتھ ضرور دوں گا۔

فرحت اللہ بیگ

ولادت: ۱۸۸۳ء

وفات: ۱۹۴۷ء

فرحت اللہ بیگ دِلّی کے محلّہ چوڑی والاں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مرزا حشمت اللہ بیگ تھا۔ فرحت ابھی کم سِن ہی تھے کہ اُن کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔اُن کی پرورش اُن کی پھوپھی حُسن جہاں بیگم نے کی۔فرحت کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔اُنھوں نے سینٹ سٹیفنز کالج سے بی۔اے کیا۔شعر و شاعری کا شوق طالب علمی کے زمانے میں پیدا ہوا۔

فرحت اللہ بیگ کو ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد جانا پڑا۔ اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔فرحت اللہ بیگ نے اپنی ۶۴ سالہ زندگی میں ۴۰ سال حیدر آباد میں گزارے۔یہ وہ دور تھا جب انگریزی تسلط کے بعد دلی شہر تہذیبی لحاظ سے عبوری دور سے گزر رہا تھا۔فرحت جب بھی دِلّی آتے اُس میں اُنھیں نت نئی تبدیلیاں نظر آتیں۔فرحت پُرانی تہذیب کے دلدادہ تھے۔اُنھیں یہ تبدیلیاں گراں گزرتیں یہی وجہ ہے کہ فرحت نے اپنی تحریروں میں پُرانی تہذیب کو محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔

مزاح نگار کی حیثیت سے فرحت اللہ بیگ کا ایک خاص مقام ہے۔اُن کی تحریریں خوش طبعی اور ظرافت کا نمونہ ہیں۔اس کے علاوہ اُن کے تحریر کردہ خاکے بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ یہ خاکے اُردو ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔اِن خاکوں میں ممدوح کی بے پناہ سچی جھوٹی تعریفوں کی بجائے حقیقی واقعات اور ممدوح کی خوبیوں، خامیوں اور کمزوریوں کے بارے میں غیر جانبداری سے تبصرہ کیا گیا ہے۔

فرحت اللہ بیگ کا اسلوب گنجلک اور بوجھل نہیں ۔ اُن کی تحریروں میں دلکشی اور چاشنی پائی جاتی ہے۔دلّی کی ٹکسالی زبان پر اُنھیں عبور تھا۔اُنھیں زبان و بیان پر مکمل قدرت حاصل تھی۔ وہ گنجلک، مشکل، ادق اور نامانوس الفاظ کے استعمال کو نامناسب سمجھتے ہیں۔زبان سیکھنے کے لیے ایسے حضرات کی کتابیں پڑھنا مفید ہے۔

تصانیف: مضامینِ فرحت، دلّی کا یادگار مشاعرہ، نذیر احمد کی کہانی: کچھ اُن کی کچھ میری زبانی وغیرہ۔

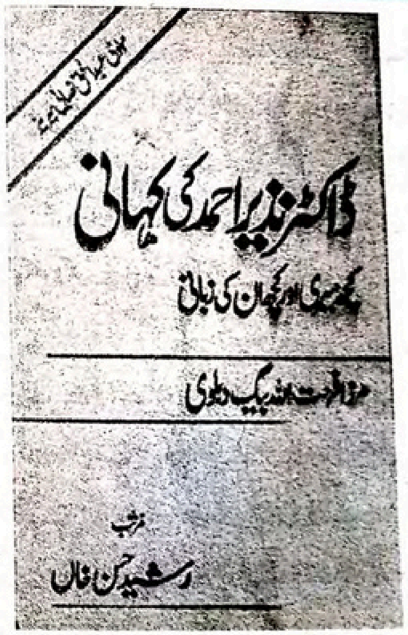

ایک وصیّت کی تعمیل

خدا بخشے، مولوی وحید الدین سلیم بھی ایک عجیب چیز تھے۔ ایک نگینہ سمجھیے کہ برسوں ناتراشیدہ رہا۔ جب تراشا گیا، چمک بڑھی، اہلِ نظر میں قدر ہوئی، اس وقت چٹ سے ٹوٹ گیا۔

شہرت بھی، غالب کے قصیدے کی طرح آج کل کسی کو راس نہیں آتی۔ اِدھر نام بڑھا اور اُدھر مرا۔ صَف سے آگے نکلا اور تیرِ قضا کا نشانہ ہوا۔ چَل چلاؤ کا زور ہے۔ آج یہ گیا، کل وہ گیا۔ مولوی نذیر احمد گئے، شبلی گئے، حالی گئے، وحید الدین گئے۔ آج کل کا مرنا بھی کچھ عجیب مرنا ہوگیا ہے۔ پہلے زندگی کو چراغ سے تشبیہ دیتے تھے، بتی جلتی، تیل خرچ ہوتا، تیل ختم ہونے کے بعد چراغ جھلملاتا، ٹمٹماتا، لو بیٹھنی شروع ہوتی اور آخر رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہوجاتا۔ اب چراغ کی جگہ زندگی، بجلی کا لیمپ ہوگئی ہے۔ اِدھر بٹن دبایا، اُدھر اندھیرا گھپ، عظمت اللہ خاں اسی طرح مرے، مولوی وحید الدین اِسی طرح رخصت ہوئے۔ اَب دیکھیں کس کی باری ہے؟ اردو کی مجلس میں دو چار لیمپ جل رہے ہیں، وہ بھی کسی وقت کھٹ سے گُل ہوجائیں گے، اس کے بعد بس اللہ ہی اللہ ہے۔

میں مدت سے حیدر آباد میں ہوں۔ مولوی وحید الدین بھی برسوں سے یہاں تھے، لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا۔ انھیں ملنے سے فرصت نہ تھی۔ مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی۔ آخر ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب مرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ گذشتہ سال کالج کے جلسے میں مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا۔ روانہ ہونے کے لیے جو حیدر آباد کے اسٹیشن پر پہنچا؟ تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے۔ طالب علم بھی ہیں، ماسٹر بھی ہیں، کچھ ضرورت سے جا رہے ہیں، کچھ بے ضرورت چلے جا رہے ہیں، کچھ واقعی مہمان ہیں، کچھ بن بلائے مہمان ہیں، غرض یہ کہ آدھی ریل انھی اورنگ آباد کے مسافروں نے

گھیر رکھی ہے۔

ریل کی روانگی میں دیر تھی۔ سب کے سب پلیٹ فارم پر کھڑے گپیں مار رہے تھے۔ میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے، بڑے بڑے ڈگ بھرتے، میری طرف چلے آرہے ہیں۔ متوسط قد، بھاری گٹھیلا بدن، بڑی سی توند، کالی سیاہ فام رنگت، اس پر سفید چھوٹی سی گول ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، شرعی سفید پائجامہ، کتھی رنگ کی کشمیری شیروانی، سر پر عنابی ترکی ٹوپی، پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتا۔ آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگالیا۔ حیران تھا کہ یاالٰہی یہ کیاماجرا ہے؟ کیا امیر حبیب اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے؟ جب ان کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چور ہوگئیں، اس وقت انھوں نے فرمایا: ''مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ جب سے تمھارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے، کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آکر ملوں، مگر موقع نہ ملا۔ قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا۔ بھئی! مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا، مرنے کے بعد ان کا نام زندہ کردیا۔ افسوس ہے ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا جو مرنے کے بعد اُسی رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا''۔

میں پریشان تھا کہ یا اللہ! یہ ہیں کون اور کیا کہہ رہے ہیں؟ مگر میری زبان کب رکتی ہے، میں نے کہا: ''مولوی صاحب! گھبراتے کیوں ہیں۔ بسم اللہ کیجیے۔ مرجایئے، مضمون میں لکھ دوں گا''۔

کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مرجائیں گے اور مجھے ان کی وصیّت کو پورا کرنا پڑے گا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحید الدین ہیں تو واقعی مجھے بہت پشیمانی ہوئی، میں نے معذرت کی۔ وہ خود شگفتہ طبیعت لے کر آئے تھے، رنج تو کجا بڑی دیر تک ہنستے اور اس جملے کے مزے لیتے رہے۔ سر ہوگئے کہ جس گاڑی میں تو ہے، میں بھی اسی میں بیٹھوں گا۔ شاگردوں کی طرف دیکھا، انھوں نے ان کا سامان لا، میرے درجے میں رکھ دیا۔ ادھر ریل چلی، اور ادھر ان کی زبان چلی۔ رات کے بارہ بجے، ایک بجا، دو بج گئے، مولوی صاحب نہ خود سوتے ہیں اور نہ سونے دیتے ہیں۔ درجہ اول میں ہم تین آدمی

تھے۔ مولوی صاحب اور رفیق بیگ۔ رفیق بیگ تو سوگئے، ہم دونوں نے باتوں میں صبح کردی۔ اپنی زندگی کے حالات بیان کیے، اپنے علمی کارناموں کا ذکر چھیڑا، اصطلاحاتِ زبانِ اردو پر بحث ہوتی رہی، شعر و شاعری ہوئی، دوسروں کی خوب خوب برائیاں ہوئیں، اپنی تعریفیں ہوئیں، مولوی عبدالحق کو برا بھلا کہا کہ اس بیماری میں مجھے زبردستی کھینچ بلایا۔ غرض چند گھنٹے بڑے مزے سے گزر گئے۔ صبح ہوتے ہوتے کہیں جا کر آنکھ لگی۔ شاید ہی گھنٹا بھر سوئے ہوں گے کہ ان کے شاگردوں اور ساتھیوں نے گاڑی پر یورش کردی۔ پھر اٹھ بیٹھے اور پھر وہی علمی مباحث شروع ہوئے۔ پھبتیاں اُڑیں، اِس کو بے وقوف بنایا، اُس کی تعریف کی۔ ہنسی اور قہقہوں کا وہ زور تھا کہ درجے کی چھت اُڑی جاتی تھی۔ اورنگ آباد تک یہی غل غپاڑا رہا۔

میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کوشش کی کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا اندازہ لگاؤں۔ پہلے تو ذرا بند بند رہے، لیکن آخر میں بالکل کھل گئے۔ میں نے جو رائے ان کے متعلق قائم کی ہے، وہ سن لیجیے۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ ان میں ظرافت کا مادہ بہت تھا، لیکن یہ ظرافت اکثر رکاکت کی صورت اختیار کرلیتی تھی۔ کسی کو برا بھی کہتے تو ایسے الفاظ میں کہتے کہ سننے سے تکلیف ہوتی اور جب کہنے پر آتے تو پھر یہ نہ دیکھتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کس کے سامنے کہہ رہا ہوں۔ نتیجہ اکثر یہ ہوتا کہ لوگ اِدھر سے اُدھر لگادیتے اور مولوی صاحب کی کسی نہ کسی سے بگڑ جاتی۔ شاید ہی کوئی بھلا آدمی ہوگا، جو سچے دل سے ان کو چاہتا ہو۔ ان کے علم، ان کی سمجھ، ان کی زُود فہمی، اور ان کی طبعِ رسا کی سب تعریف کرتے ہیں، لیکن ان کی طبیعت کے سب شاکی ہیں اور وہ خود بھی اس سے بیزار تھے۔

بات یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کی وہ ٹھوکریں کھائی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ خاصا بھلا چنگا آدمی دیوانہ ہوجائے۔ اگر مولوی صاحب کی طبیعت پر ان مصیبتوں نے اتنا اثر کیا، تو کیا تعجب ہے۔ جب کسی نااہل کو بڑی خدمت پر دیکھتے تو ان کے آگ لگ جاتی۔ ریل میں دو ایک بڑے شخصوں کا ذکر آیا انھوں نے ہر دفعہ یہی کہا: ''اے میاں! گدھا ہے، ایک سطر صحیح نہیں لکھتا اور دیکھو تو کون ہیں کہ نواب صاحب، ہم کو دیکھو، تمام عمر علم حاصل کرنے میں گزری۔ اس اخبار کی ایڈیٹری کی، اس رسالے کے منیجر ہوئے۔ سرسید کی

خدمت میں سرگاڑی پاؤں پھیلا کیا۔ اب جو چند روپلی مل رہے ہیں ،تو فلاں صاحب جلے جاتے ہیں، خبر نہیں کچھ ہوتے تو گلا ہی گھونٹ دیتے''۔

میں نے کہا: '' مولوی صاحب! یہ دنیا ہے آخرت نہیں ہے کہ جیسا بوؤ گے ویسا پھل ملے گا۔ یہاں اہلِ کمال ہمیشہ آشفتہ حال رہے ہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا دل جلاتے ہیں۔ جو اللہ نے دیا ہے ، بہت ہے'' آگے ناتھ نہ پیچھے پگا''۔ مزے کیجیے بہت گئی ہے، تھوڑی رہی ہے، ہنسی خوشی یہ بھی گزار دیجیے۔

وہ بھلا میری باتوں کو کیا سننے والے تھے، ان کے تو دل میں زخم تھے۔ تمام عمر مصیبت اٹھائی تھی، نااہلوں کو آرام و آسائش میں دیکھ کر وہ زخم ہرے ہوجاتے تھے۔ زبان اپنی تھی، کسی کا دینا نہیں آتا تھا۔ بے نقط سنا کر دل ٹھنڈا کرلیتے تھے۔

زمانے کے ہاتھوں ان کی طبیعت میں ایک دوسرا انقلاب یہ بھی ہوگیا تھا کہ جتنی اُن کی نگاہ وسیع ہوئی، اتنا ہی ان کا دل تنگ ہوا۔ جتنی ان کے قلم میں روانی پیدا ہوئی، اتنی ہی ان کی مٹھی بند ہوئی۔ میں ان کے پیٹھ پیچھے نہیں کہتا۔ جب ان کے منہ پر کہہ چکا ہوں کہ مولوی صاحب، آپ کی کفایت شعاری نے بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کرلی ہے، تو اب لکھتے کیوں ڈروں۔ واقعی بڑے ہی کنجوس تھے۔ ہزار روپے کے گریڈ میں تھے۔ دارالترجمہ سے بہت کچھ مل جاتا تھا، مگر خرچ کی پوچھو تو صفر سے کچھ ہی زیادہ ہوگا۔ اُس کی صراحت، میں آگے چل کر کروں گا، ہاں! اُن کا یہ عذر سب کو ماننا پڑے گا کہ مفلسی کے پے در پے حملوں نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اُن کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس خدمت پر کب تک ہیں اور کب نکال دیے جائیں گے۔ خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھتے بھرنے کی فکر میں رہے۔ خود چل بسے اور جمع پونجی دوسروں کے لیے چھوڑ گئے اور چھوڑ بھی اتنی گئے کہ بعض لوگوں کو افسوس ہوا کہ ہم ان کے بیٹے کیوں نہ ہوئے۔

بہرحال یونہی ہنستے، بولتے دو بجے اورنگ آباد پہنچ گئے۔ بڑے زور کا استقبال ہوا۔ موٹروں میں لد کر کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں سے وہاں تک خیمے ہی خیمے لگے ہیں۔ خیموں کے سامنے جلسے کا

منڈوا ہے۔ منڈوے کے سامنے جو خیمہ تھا، اس میں مجھے اور مولوی صاحب کو جگہ ملی۔ مولوی صاحب کی طبیعت پہلے سے بدمزا تھی۔ راستے کی تھکان اور رات بھر کے جاگنے سے اور خراب ہوگئی۔ بخار چڑھ آیا۔ دو وقت کھانا نہیں کھایا۔ تیسرے وقت بڑے کہنے سننے سے تھوڑا سادودھ پیا۔

دوسرے روز ان کا لیکچر تھا۔ طبیعت صاف نہیں تھی، پھر بھی بڑے میاں کو جوش آ گیا۔ ٹرنک میں سے جوڑا نکالا۔ ریشمی شیروانی نکالی، نئی ترکی ٹوپی نکالی، اپنا میلا کچیلا جوڑا پھینک، نیا پہن اس ٹھاٹھ سے جلسے میں آئے کہ واہ واہ واہ۔کھڑے ہو کر لیکچر دینے کا دَم نہ تھا، کرسی بچھا دی گئی۔ انھوں نے جیب میں سے چھوٹے چھوٹے نیلے کاغذ کے پرچوں کی ایک گڈی نکالی اور لیکچر پڑھنا شروع کیا۔

میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ اسپیچ کے پڑھنے میں الفاظ کا زور کم ہوجاتا ہے، مگر مولوی صاحب کے طرزِ ادا نے میرا خیال بالکل بدل دیا۔ اُن کے پڑھنے میں بھی وہی بلکہ اس سے زیادہ زور تھا۔ جتنا بولنے میں ہوتا ہے، معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے۔ دو ہزار آدمی کا مجمع تھا، مگر سناٹے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو آواز سن لو۔ لفظوں کی نشست، زبان کی روانی، آواز کے اُتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آرہا ہے۔ ایک برقی رو ہے کہ کانوں سے گزر کر دل و دماغ پر اثر کررہی ہے، مگر اب تک وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے بڑے بڑے لیکچر دینے والوں کو سنا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ پڑھ کر ایسا اثر پیدا کرنے والا، میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔ کچھ تو بات تھی کہ آخر زمانے میں سرسید مرحوم اپنے اکثر لیکچر انھیں سے پڑھوایا کرتے تھے۔ اس میں ان کا مدِ مقابل نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

اُسی روز ایک واقعہ پیش آیا کہ اس کا خیال کرکے اب تک مجھے ہنسی آتی ہے۔ ''۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ'' اسی جلسے میں زندہ کیا گیا تھا۔ وہی سازوسامان، وہی کپڑے اور وہی لوگ، سو برس کے بعد پھر سامنے لائے گئے تھے۔ اسٹیج کے انتظام ہی کے لیے مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے پکڑ بلایا تھا۔ پہلے بہروپ اور نقلیں ہوتی رہیں، آخر پردہ گرا اور مشاعرے کا نمبر آیا۔ تھوڑی دیر میں سٹیج کا رنگ بدلنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ دریاں، چاندنیاں، قالین بچھانا، گاؤ تکیے لگانا، سامان جمانا، مشعلیں جلانا، غرض اتنا کام تھا کہ

پردہ گرے گرے بڑی دیر ہوگئی اور لوگوں میں ذرا ہل چل ہونے لگی۔ مجھے اس وقت سوا اس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ ایک چھوٹی سی تقریر کرکے اس بے چینی کو کم کروں۔ میں نے کہا "یارو! ذرا جلدی کرو، دیر ہو رہی ہے، مزا کرکرا ہوجائے گا۔ میں باہر جا کر کچھ بولنا شروع کرتا ہوں۔ تمھارا کام جب ختم ہوجائے، تو سیٹی بجادینا، میں اپنی اسپیچ ختم کردوں گا"۔ اتنا کہہ کر میں چٹ باہر پردے کے سامنے آگیا۔ مضمون سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا، اس وقت یہی سمجھ میں آیا کہ اپنے مضمون کی تمہید کو ذرا مذاق میں ادا کروں۔

جن صاحبوں نے وہ مضمون پڑھا ہے، وہ واقف ہیں کہ میں نے اس مضمون کو مولوی کریم الدین صاحب "طبقات الشعرائے ہند" سے منسوب کرکے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ مشاعرہ انھی کے مکان پر نواب زین العابدین خان کی مدد سے ہوا۔ چنانچہ میں نے اپنے لیکچر میں ابتداً اس زمانے کی دہلی کا نقشہ کھینچا اور پھر مولوی کریم الدین صاحب کا پانی پت سے دہلی آنا مزاحیہ پیرائے میں بیان کیا۔ ان کی پھٹی ہوئی جوتیوں، ان کے خاک آلودہ کپڑوں، ان کی وحشت زدہ شکل اور ان کی مفلسی کا نقشہ خدا جانے کن الفاظ میں کھینچ گیا۔ پھر ان کے دہلی میں آکر تعلیم پانے، مسجد کی روٹیوں پر پڑے رہنے، دوسروں کی مدد سے مطبع کھولنے کا ذکر کرکے یہ بتایا کہ آخر کس طرح اس مشاعرے کی اجازت ہوئی اور کس طرح دہلی کے تمام شعراء اس میں جمع ہوئے۔

میں اسپیچ دینے میں سیدھا کھڑا نہیں رہتا، کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلاتا ہوں۔ خدا معلوم مولوی کریم الدین کا حال بیان کرنے میں کیوں میرے ہاتھ کا اشارہ کئی دفعہ مولوی وحید الدین سلیم کی طرف ہوگیا۔ مجھے تو معلوم نہیں، مگر جلسے میں اس نے کچھ اور ہی معنی پیدا کرلیے۔ مولوی وحید الدین کے والد بھی پانی پت سے دہلی آئے تھے۔ کتابوں کا بیوپار کرتے تھے۔ لوگ سمجھے کہ مولوی کریم الدین ہی مولوی وحید الدین کے والد تھے۔ ناموں کے یکساں ہونے نے اس خیال کو اور تقویت دی، اب جو ہے وہ مولوی صاحب سے پوچھتا ہے۔ "مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟"

مولوی صاحب کے تاؤ کی کچھ نہ پوچھو، دل ہی دل میں اونٹے رہے۔ خدا خدا کرکے ڈیڑھ بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ اسٹیج کے دروازے سے جو نکلتا ہوں، تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب دیوار سے چپکے

کھڑے ہیں مجھے دیکھتے ہی بپھر گئے۔ کہنے لگے "فرحت! یہ سب تیری شرارت ہے۔ کریم الدین کو میرا باپ بنادیا۔" میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں؟ بڑی مشکل سے مولوی صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ وہاں سے لے جا کر خیمے میں بٹھایا، پان بنا کر دیا، سگریٹ پیش کیا، جب جا کر ذرا نرم پڑے اور واقعہ بیان کیا۔

میں نے کہا: "مولوی صاحب! بھلا مجھ سے ایسی گستاخی ہوسکتی تھی۔ اول تو اس مذاق کا یہ موقع ہی کیا تھا، دوسرے مجھے کیا معلوم کہ آپ کے والد کون تھے، کہاں کے تھے، دہلی آئے بھی تھے یا نہیں، کتابیں بیچتے تھے یا کیا کرتے تھے؟"

کہنے لگے: "تو گھڑی گھڑی، ہاتھ سے میری طرف کیوں اشارہ کرتا تھا"۔ میں نے کہا: "مولوی صاحب! اسپیچ دلیئے میں ہاتھ کا اشارہ خود بہ خود اسی طرح ہوجاتا ہے۔ اب اگر اگلی صف میں بیٹھ کر آپ اس اشارے کو اپنے سے متعلق کرلیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

بہر حال یہ بات لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسی جم گئی کہ مٹائے نہ مٹی۔ جب تک اورنگ آباد میں رہے، ہر شخص مولوی صاحب سے یہی سوال کرتا تھا: "مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟ یہ کبھی تو ہنس کر چپ ہوجاتے، کبھی صرف جھڑک دیتے، کبھی جل کر کہتے: "جی ہاں، میرے والد تھے، کچھ آپ کا دینا آتا ہے"۔

اورنگ آباد سے واپس آنے کے بعد میرا ان کے ہاں آنا جانا بہت ہوگیا تھا۔ جب کچھ لکھتا، پہلے ان کو جا کر سناتا۔ بڑے خوش ہوتے، تعریفیں کرتے، دل بڑھاتے، ہائے ان کے گھر کا نقشہ اس وقت آنکھوں میں پھر گیا۔ گھر بہت بڑا تھا، مگر خالی ڈھنڈار، ساٹھ روپے مہینا کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے۔ نہ بال نہ بچہ، نہ نوکر، نہ ماما، میں گیا، باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ آواز آئی: "کون؟"

میں نے کہا: "فرحت۔" اُسی وقت کرتا پہنتے ہوئے آئے، دروازہ کھولا، اندر لے گئے۔ برآمدے میں ایک بان کی چارپائی پڑی ہے، دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں۔ اندر ایک ذرا سی دری بچھی

ہے، اس پر میلی چاندنی ہے۔ دو چار چوہا چٹ تکیے اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔ دیواروں پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین چار پرانے کیلنڈر لٹکے ہیں۔ سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھے کنڈا ٹوٹی چائے کی پیالیاں، کنارے جھڑی رکابیاں، ایک دو چائے کے ڈبے رکھے ہیں۔ سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں، دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں۔ نیچے دو تین پرانے کھڑ تک جوتوں کے جوڑے پڑے ہیں۔ لیجیے، مولوی صاحب کے گھربار کا یہ خلاصہ ہے۔ مولوی صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں۔ ایک پر پانی، دوسری پر دودھ جوش ہورہا ہے۔ چائے بن رہی ہے، خود پی رہے ہیں، دوسروں کو پلا رہے ہیں، ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے، چائے بنائی، نمک کے ڈلے کو ڈال، دو ایک چکر دے، نکال لیا۔ بس سارے دن ان کا یہی شغل تھا۔ گھر میں برتن ہی نہیں تھے، کھانا کیسے پکتا اور کون پکاتا؟ خبر نہیں کہاں جا کر کھا پی آتے تھے؟

کبھی میں گیا، دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے، سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کہیں چڑنے چگنے تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ پوچھا بھی کہ مولوی صاحب! آپ کے ہاں کچھ پکتا پکاتا نہیں، کہنے لگے: ”نہیں بھئی، میں نے تو مدتوں سے کھانا چھوڑ دیا ہے، صرف چائے پر گزران ہے“۔

تم مان لو، میں تو نہیں مانتا، میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کو کھاتے اور خوب کھاتے دیکھا ہے۔ ہاں، یہ ضرور کہ اپنے گھر کا پکا نہیں کھاتے تھے اور کھاتے تو کیوں کر کھاتے، پکانے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ما مار کھنی پڑتی۔ سامان منگوانا ہوتا۔ لکڑی کا خرچ، تیل کا خرچ، نون کا خرچ، غرض اتنے خرچ کون اپنے سر باندھے اور اپنی بھلی چنگی جان کو بیٹھے بٹھائے روگ لگائے۔ چائے بنالی، پی لی، اِدھر اُدھر گئے۔ پیٹ بھرلیا، گھر آئے، بان کی کھری چارپائی پر لوٹ ماری، چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا۔

ان کی بان کی چارپائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی۔ ننگی پیٹھ اس پر اتنا لوٹے تھے کہ بان صاف اور چمکدار ہو کر کالی اطلس ہوگیا تھا۔ ادوان خود کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو، تو طبلے کی آواز دے۔ خدا معلوم یہ چارپائی کس کے قبضے میں ہے؟ کسی کے پاس بھی ہو، سونے میں بڑا آرام دے گی۔

مولوی صاحب کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ ان کے بھی یار، دوست، شاگرد غرض کوئی نہ کوئی ان کو مٹھائی پہنچا ہی دیتا تھا۔ یہ کچھ کھاتے، کچھ رکھ چھوڑتے۔ مٹھائی کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتے، ان کو پونچھ پانچھ، صاف کر، جمع کرتے جاتے، انھی کاغذوں پر خط لکھتے، غزلیں لکھتے، غرض جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا بس اِن ہی کاغذوں پر ہوتا، خدا معلوم ایسے جھر جھرے کاغذ پر یہ لکھتے کیوں کر تھے۔

مولوی صاحب دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ ہاں! ڈرتے تھے تو مولوی عبدالحق صاحب سے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ان کی رائے معلوم کروں، مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹال گئے۔ تھوڑے دن اور جیتے تو پوچھ ہی لیتا۔ دوسروں کے متعلق مجھے ان کی رائے معلوم ہے۔ اگر ان ہی کے الفاظ میں لکھوں تو ابھی فوج داری ہوجائے۔

مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ ایسے ایسے الفاظ دماغ سے اتارتے کہ بایدوشاید۔ جہاں ثبوت طلب کیا اور انھوں نے شعر پڑھا اور کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کردیا۔ اب خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ خود اُن کا شعر ہوتا تھا یا واقعی اُس شاعر کا۔ بھلا ایک ایک لفظ کے لیے کون دیوان ڈھونڈنے بیٹھے اگر کوئی تلاش بھی کرتا اور وہ شعر دیوان میں نہ ملتا تو یہ کہہ دینا کیا مشکل تھا کہ یہ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، مگر انگریزی اصطلاحات پر پورے حاوی تھے۔ یہی نہیں بلکہ یہاں تک جانتے تھے کہ اس لفظ کے کیا ٹکڑے ہیں، ان ٹکڑوں کی اصل کیا ہے اور اس اصل کے کیا معنے ہیں۔ اس بلا کا حافظہ لے کر آئے تھے کہ ایک دفعہ کوئی لفظ سنا اور یاد ہوگیا۔ الفاظ کے ساتھ انھوں نے اس پر بھی بہت غور کیا تھا کہ انگریزی میں اصطلاحات بنانے میں کن اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ انھیں اصولوں کو وہ اردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں کام میں لاتے اور ہمیشہ کامیاب ہوتے۔ میری کیا، اس وقت سب کی یہ رائے ہے کہ اصطلاحات بنانے کے کام میں مولوی وحید الدین سلیم اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور اب ان کے بعد ان کا بدل ملنا دشوار تو کیا، ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اچھی دسترس تھی، مگر وہ اردو کے لیے بنے تھے اور اردو، ان کے لیے، خوب سمجھے تھے اور خوب سمجھاتے تھے۔ زبان کے جو نکات وہ اپنے شاگردوں کو بتا گئے

ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ کالج کے لونڈے وہ مضمون لکھ جاتے ہیں، جو بڑے بڑے اہلِ قلم کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتے۔

• مولوی صاحب کیا مرے، زبانِ اردو کا ایک ستون گر گیا اور ایسا ستون گرا کہ اس جیسا بننا تو کجا، اس حصے میں اڑ واڑ بھی لگانی مشکل ہے۔ ان کی جگہ بھرنے کے لیے دوسرے پروفیسر کی تلاش ہو رہی ہے، مگر عثمانیہ یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد لکھ رکھیں کہ چاہے اِس سرے سے اُس سرے تک ہندوستان چھان مارو، مولوی وحید الدین سلیم جیسا پروفیسر ملنا تو بڑی بات ہے، ان کا پاسنگ بھی مل جائے، تو غنیمت اور بہت غنیمت سمجھو۔

(مضامینِ فرحت)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

(الف) مولوی صاحب اور فرحت اللہ بیگ کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟

(ب) مولوی صاحب کا حلیہ اپنے الفاظ میں بیان کریں؟

(ج) فرحت نے مولوی صاحب کے مزاج کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا؟

(د) حیدر آباد کالج کے سالانہ جلسے میں کیا غلط فہمی پیدا ہوئی؟

(ہ) مولوی صاحب اپنی کفایت شعاری کے بارے میں کیا عذر پیش کیا کرتے تھے؟

(و) ''اور مولوی صاحب کی کسی نہ کسی سے بگڑ جاتی'' اس جملے کی وضاحت کریں؟

(ز) مولوی صاحب نے اصطلاحات وضع کرنے کے لیے کن اصولوں کا سہارا لیا؟

۲۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

(الف) تیل ختم ہونے سے پہلے چراغ جھلملاتا، ٹمٹماتا، لو بیٹھنی شروع ہوتی اور آخر رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اب چراغ کی جگہ زندگی بجلی کا لیمپ ہوگئی ہے۔ ادھر بٹن دبایا، ادھر گھپ اندھیرا۔

(ب) مگر میری زبان کب رُکتی ہے۔ میں نے کہا: ''مولوی صاحب! گھبراتے کیوں ہیں، بسم اللہ کیجیے، مر جایئے، مضمون میں لکھ دوں گا''

(ج) زبان اپنی تھی، کسی کا دینا نہیں آتا تھا، بے نقط سُنا کر دل ٹھنڈا کر لیتے تھے۔

(د) خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھتے بھرنے کی فکر میں رہے۔

(ہ) جتنی اُن کی نگاہ وسیع ہوئی، اتنا ہی اُن کا دل تنگ ہوا۔

۳۔ خالی جگہ مناسب الفاظ سے پُر کریں:

(الف) صف سے آگے بڑھا اور تیر ________ کا شکار ہوا۔

(ب) ایک بڑے میاں بڑے بڑے ________ بھرتے میری طرف آ رہے ہیں۔

(ج) اُن کی زُود ________ کی سب تعریف کرتے تھے۔

(د) اہل کمال ہمیشہ ________ حال رہے ہیں۔

(ہ) میں نے اُس ________ کی دلّی کا نقشہ کھینچا۔

(و) خُدا شکر خورے کو ________ دیتا ہے۔

۴۔ درج ذیل الفاظ پر ان کے سامنے لکھے گئے معنی کے مطابق اعراب لگائیں۔

خم (ٹیڑھا پن)	خم (شراب کا مٹکا)
کرم (مہربانی)	کرم (کیڑا)
کل (تمام، میزان)	کل (پُرزہ، گزرا یا آنے والا دن)
محقق (تحقیق کرنے والا)	محقق (جس پر تحقیق کی گئی ہو)
منتظر (انتظار کرنے والا)	منتظر (جس کا انتظار کیا جائے)

چراغ حسن حسرت

ولادت: ۱۹۰۴ء

وفات: ۱۹۵۵ء

اصل نام چراغ حسن تھا جبکہ تخلص حسرت تھا۔ وہ کشمیر کے مشہور علاقے بارہ مولا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جموں سے حاصل کی۔ مزید تعلیم کے حصول کے لیے لاہور آگئے۔ یہاں ان کے حلقۂ احباب میں اکثر لوگوں کا تعلق صحافت سے تھا۔ چنانچہ حسرت بھی کوچۂ صحافت میں جا نکلے۔ حسرت نے مختلف اخبارات میں کام کیا۔ انھوں نے ''سند باد جہازی'' کے نام سے فکاہیہ کالم لکھنا شروع کیے۔ ان کالموں میں حسرت کی فطری صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں۔ مختلف اخبارات میں کام کرتے ہوئے بالآخر ''روزنامہ امروز'' سے وابستہ ہوئے اور آخری دم تک اسی سے منسلک رہے۔

حسرت ایک مشہور صحافی اور مقبولِ عام مزاح نگار تھے۔ ان کے مضامین کو واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ کالم جو اخبارات کی زینت بنتے رہتے تھے۔ دوسرے وہ شخصی خاکے جو انھوں نے مختلف شخصیات کے تعارف کے طور پر لکھے۔ دونوں میں حسرت کی روایتی ظرافت جھلکتی ہے۔ ان کی فکاہیہ کالم نویسی نے اخبارات کی دنیا میں اہم روایات کی بنیاد ڈالی۔ ان کے کالموں کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ حسرت کی زبان سادہ، رواں اور سلیس ہے۔ ان کو الفاظ و تراکیب کے استعمال کا خاص ملکہ تھا۔ خاکہ نگاری میں انھوں نے ایسی شخصیات کا انتخاب کیا، جن کے ساتھ ان کی گہری وابستگی اور خلوص تھا۔

تصانیف: فکاہیات، حرف و حکایت، کیلے کا چھلکا، جدید جغرافیہ پنجاب، مردم دیدہ وغیرہ۔

علامہ اقبالؒ

میکلوڈ روڈ پر لکشمی انشورنس کمپنی کی عمارت سے کچھ آگے سنیما ہے۔ سنیما سے اِدھر ایک مکان چھوڑ کے ایک پرانی کوٹھی ہے، جہاں آج کل آنکھوں یا دانتوں کا کوئی ڈاکٹر رہتا ہے۔ کسی زمانے میں علامہ اقبالؒ یہیں رہا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں یہیں پہلی مرتبہ ان کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اب بھی میں اس طرف سے گزرتا ہوں، تو اس کوٹھی کے قریب پہنچ کر قدم رُکتے معلوم ہوتے ہیں اور نظریں بے اختیار اس کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔

کوٹھی اچھی خاصی تھی۔ صحن بھی خاصا کشادہ، ایک طرف شاگرد پیشہ کے لیے دوتین کمرے بنے ہوئے تھے، جن میں علامہ اقبالؒ کے نوکر چاکر علی بخش، رحمان، دیوان علی وغیرہ رہتے تھے، لیکن کوٹھی کی دیواریں سیلی ہوئی۔ پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا۔ چھتیں ٹوٹی پھوٹی۔ منڈیر کی کچھ اینٹیں اپنی جگہ سے اس طرح سرکی ہوئی تھیں کہ ہر وقت منڈیر کے زمین پر آرہنے کا اندیشہ تھا۔ میرؔ کا مکان نہ سہی، بہرحال غالبؔ کے بَلّی ماراں والے مکان سے ملتا جلتا نقشہ ضرور تھا۔

کوٹھی کے صحن میں چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی پر اُجلی چادر، اس پر علامہ اقبالؒ ململ کا کرتہ پہنے، تہ بند باندھے تکیے سے ٹیک لگائے حقہ پی رہے تھے۔ سرخ و سپید رنگ، بھرا ہوا جسم، سر کے بال کچھ سیاہ کچھ سپید۔ داڑھی گھٹی ہوئی، چارپائی کے سامنے کچھ کرسیاں تھیں۔ ان پر دو تین آدمی بیٹھے تھے۔ دو تین اٹھ کے جارہے تھے۔ سالک صاحب میرے ساتھ تھے۔ علامہ اقبالؒ نے پہلے ان کی مزاج پرسی کی پھر میری طرف توجہ فرمائی۔

اِن دنوں نمک کی ستیاگرہ زوروں پر تھی۔ ڈانڈی کے مارچ کے چرچے جگہ جگہ ہو رہے تھے۔ لاہور میں جلوس نکلتے، جلسے ہوتے اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگتے تھے۔ میں نے پہلے کبھی کھدر کا لباس نہیں پہنا تھا۔ مگر یہ تو کھدر کا خاص موسم تھا، کچھ رواجِ عام کا اثر کچھ کفایت کا خیال، میں نے بھی یہی لباس پہننا شروع کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کا ذہن میرے کھدر کے لباس سے چرخے، چرخے سے گاندھی اور گاندھی سے کانگریس کی جانب منتقل ہوگیا کیونکہ اس رسمی تعارف کے بعد انھوں نے جو گفتگو شروع کی اس کی لپیٹ میں گاندھی، کانگریس اور اہنسا سب کے سب آگئے تھے۔

موضوع روکھا پھیکا تھا، مگر بیچ بیچ میں لطیفے بھی ہوتے جاتے تھے۔ میں تو ہوں ہاں کر کے رہ جاتا تھا۔ مگر سالک صاحب کب رُکتے تھے۔ جہاں موقع ملتا تھا کوئی لطیفہ، کوئی چٹکلہ، کوئی پھبتی ضرور کہہ دیتے تھے۔ ہم جب گئے تھے، تو سورج چھپنے میں کوئی آدھ گھنٹہ باقی تھا، مگر اٹھے تو اچھی خاصی رات ہوچکی تھی۔ مجھے لاہور آئے سوا سال سے اوپر ہوچکا تھا، لیکن زیادہ لوگوں سے ربط نہیں تھا۔ یا تنہا گھر میں بیٹھا ہوں یا سالک صاحب کے ہاں، ہفتے میں ایک دو مرتبہ حکیم فقیر محمد صاحب چشتی کے ہاں بھی چلا جاتا تھا، لیکن اب جو علامہ اقبالؒ کی خدمت میں باریاب ہونے کا موقع ملا، تو ایک اور ٹھکانا ہاتھ آگیا۔ کچھ دنوں میں یہ کیفیت ہوئی کہ اول تو دوسرے تیسرے ورنہ ساتویں آٹھویں دن ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا تھا۔ کبھی کسی دوست کے ساتھ کبھی اکیلا مگر جب جاتا تھا، گھنٹہ دو گھنٹہ ضرور بیٹھتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ بارہ بارہ بجے تک برابر محفل جمی ہے۔ لوگ آرہے ہیں جارہے ہیں، ادب، شاعری، سیاست، مذہب پر بحثیں ہو رہی ہیں لیکن ان محفلوں میں سب سے زیادہ علامہ اقبالؒ باتیں کرتے تھے۔ دوسرے لوگوں کی حیثیت زیادہ تر "سامعین" کی ہوتی تھی۔ میرا مقصود یہ نہیں کہ وہ دوسروں کو بات کرنے کا موقع نہیں دیتے تھے یا بات کاٹ کے بولنا شروع کر دیتے تھے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہر مسئلے کے متعلق ان کی معلومات دوسروں سے زیادہ ہوتی تھیں اور اہلِ محفل کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ چند جملے کہہ کے چپکے ہو رہیں۔

ان کے مکان کے دروازے غریب و امیر، ادنیٰ و اعلیٰ سب پر کھلے تھے نہ کوئی حاجب، نہ دربان، نہ ملاقات کے لیے کارڈ بھجوانے کی ضرورت، نہ تعارف کے لیے کسی واسطے کی حاجت، جو آتا ہے کرسی کھینچ کے بیٹھ جاتا ہے یا تو خود اپنا تعارف کرا دیتا ہے یا چپ چاپ بیٹھا باتیں سنتا رہتا ہے۔ علامہ اقبالؒ باتیں کرتے کرتے تھوڑی دیر کے لیے رکتے ہیں، تو اس کی طرف توجہ فرماتے ہیں اور پوچھتے ہیں ''فرمایئے کہاں سے آنا ہوا''؟ وہ اپنا نام بتاتا ہے کوئی حاجت ہوتی ہے، تو بیان کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر کہتے ہیں کہ ایک رات کو میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر تھا، کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے کہ ایک شخص جس کے سر کے بال بڑھے ہوئے تھے اور کچھ بدحواس معلوم ہوتا تھا، آیا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ علامہ اقبالؒ کچھ دیر کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے ''فرمایئے کہاں سے تشریف لائے؟'' وہ کہنے لگا ''یوں ہی آپ سے ملنے چلا آیا تھا۔'' خدا جانے علامہ اقبالؒ نے اس کے چہرے سے کیا معلوم کر لیا کہ اس نے کھانا نہیں کھایا یا کوئی اور بات تھی۔ بہر حال انھوں نے پوچھا: ''کھانا کھایئے گا''۔ اس نے جواب دیا۔ ''جی ہاں کھلا دیجیے''۔ علامہ اقبالؒ نے علی بخش کو بلا کے کہا۔ ''انھیں دوسرے کمرے میں لے جا کے کھانا کھلا دو''۔ یہ سن کر وہ کہنے لگا۔ ''میں کھانا یہیں کھاؤں گا''۔ غرض علی بخش نے وہیں دسترخوان بچھا کر اسے کھانا کھلایا۔ وہ کھانا کھا کے بھی نہ اٹھا اور وہیں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ رات اچھی خاصی جا چکی تھی اس لیے میں اسے وہیں چھوڑ کے گھر چلا آیا۔ دوسرے دن علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ کیوں ڈاکٹر صاحب رات جو شخص آیا تھا اس کا کیا ہوا؟ کہنے لگے۔ ''تمھارے جانے کے بعد میں نے اس سے کہا کہ اب سو جایئے، لیکن وہ کہنے لگا کہ آپ کے کمرے میں ہی پڑ رہوں گا۔ چنانچہ علی بخش نے میرے کمرے کے دروازہ کے ساتھ اسے چارپائی بچھا دی صبح سویرے اٹھ کر وہ کہیں چلا گیا!''

ان سے جو لوگ ملنے آتے تھے۔ ان میں کچھ تو روز کے آنے والے تھے کچھ دوسرے تیسرے اور کچھ ساتویں آٹھویں دن آتے تھے۔ بہت سے لوگ ایسے تھے، جنھیں عمر بھر میں صرف ایک آدھ مرتبہ ان سے

ملنے کا موقع ملا، پھر بھی ان کے ہاں ہر وقت میلا سا لگا رہتا تھا۔ جب جاؤ دو تین آدمی بیٹھے ہیں۔ کوئی سفارش کرانے آیا ہے، کوئی کسی شعر کے معنی پوچھ رہا ہے، کسی نے آتے ہی سیاسیات کے متعلق بحث چھیڑ دی ہے اور کوئی مذہب کے متعلق اپنے شکوک بیان کر رہا ہے۔ اکثر لوگ جو باہر کے کسی شہر سے لاہور کی سیر کرنے آتے تھے۔ ان کی کوٹھی پر حاضر ہونا واجبات میں سے سمجھتے تھے کیونکہ لاہور آ کے ڈاکٹر اقبالؒ کو نہ دیکھا تو کیا دیکھا؟ ایسے لوگ بھی تھے جو ان کے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھا دیکھ کر ان سے علاج کرانے آ جاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص ان سے دانت نکلوانے چلا آیا تھا، جب اسے معلوم ہوا، ڈاکٹر اقبالؒ علاج کرنا نہیں جانتے، تو وہ بہت حیران ہوا اور کہنے لگا کہ یہ کیسے ڈاکٹر ہیں جنھیں دانت نکالنا بھی نہیں آتا!

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں، جنھیں علامہ اقبالؒ سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کا اشتیاق عمر بھر رہا مگر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کو ان کی طبیعت کا حال معلوم نہیں تھا۔ وہ ان کی عظمت کے ذکر اذکار سن کر اور ان کے نام کے ساتھ سر جیسا پُر رُعب خطاب دیکھ کر دل میں سمجھتے تھے کہ ان کے حضور میں ہم ایسے غریب لوگوں کی رسائی کہاں؟ میرے ایک عزیز دوست جو علامہ اقبالؒ کے سچے عقیدت مند ہیں، ان کی وفات سے کوئی دو مہینے کے بعد مجھ سے ملنے آئے اور جب تک بیٹھے رہے انھیں کا ذکر کرتے رہے۔ جب انہیں میری زبانی معلوم ہوا کہ علامہ اقبالؒ سے ہر شخص مل سکتا تھا، تو انھوں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا اور کہنے لگے ''تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟ مجھے کئی سال سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی تمنا تھی، مگر حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ جی میں سوچتا تھا کہ کسی تقریب کے بغیر کیسے ملوں؟ کیا عجب ہے کہ وہ ملنے سے انکار ہی کر دیں۔ کئی دفعہ اس شوق میں ان کی کوٹھی تک آ گیا مگر اندر قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑی اس لیے باہر سے ہی الٹے پاؤں لوٹ آیا''۔

علامہ اقبالؒ بہت سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے۔ گھر میں تو وہ ہمیشہ تہ بند اور کرتے میں نظر آتے، البتہ باہر نکلتے تو کبھی کوٹ پتلون پہن لیتے تھے۔ کبھی فراک کوٹ کے ساتھ شلوار اور ترکی ٹوپی ہوتی تھی۔ ولایت جانے سے پہلے وہ پنجابیوں کا عام لباس پہنتے تھے، یعنی کبھی مشہدی لنگی کے ساتھ فراک کوٹ

اور شلوار، کبھی سپید ململ کی پگڑی۔ وہ شیروانی اور چست گھٹنا بھی پہنتے رہے ہیں مگر بہت کم۔ میں نے اس لباس میں انھیں دیکھا تو نہیں البتہ قیاس کہتا ہے کہ شیروانی اور چست گھٹنا ان کے جسم پر بہت کھلتا ہوگا۔

وہ کھانا کم کھاتے تھے مگر ہمیشہ اچھا کھاتے تھے۔ مدت سے ان کا یہ دستور تھا کہ رات کو کھانا نہیں کھاتے تھے صرف نمکین کشمیری چائے پر اکتفا کرتے تھے۔ دسترخوان پر ہمیشہ دو تین سالن ضرور ہوتے تھے۔ پلاؤ اور کباب انہیں بہت مرغوب تھے۔ شبدیگ بھی بہت پسند تھی۔ جاڑے کے دنوں میں بڑے چاؤ سے شب دیگ پکواتے اور خشکے کے ساتھ کھاتے تھے۔ پھلوں میں صرف آموں سے رغبت تھی۔ آموں کی فصل میں لگن اور سینیاں بھر کے بیٹھ جاتے۔ خود کھاتے، احباب کو کھلاتے، لطیفے کہتے، آپ ہنستے، دوسروں کو ہنساتے تھے۔

جوانی کے زمانے میں ان کا معمول یہ تھا کہ صبح اٹھ کے نماز پڑھتے۔ قرآن کریم کی تلاوت کرتے پھر ورزش کرنا شروع کردیتے۔ ڈنڑ پیلتے، مگدر ہلاتے اور جب سارا جسم عرق عرق ہوجاتا۔ تو مگدر ہاتھ سے چھوٹتا، سن زیادہ ہوگیا، تو ورزش چھوٹ گئی۔ البتہ قرآن کریم کی تلاوت آخر تک جاری رہی۔

عام طور پر پنجابی بولتے تھے۔ کبھی کبھی اثنائے گفتگو میں انگریزی بولنا بھی شروع کردیتے تھے۔ یو۔پی کے جو شاعر اور ادیب ان سے ملنے آتے تھے، انھیں علامہ اقبال کے ڈیل ڈول لب و لہجہ اور گفتگو کے انداز پر حیرت ہوتی تھی کیونکہ ان لوگوں کے ذہن میں شاعر کا تصور یہ ہے کہ تیکھے تیکھے نقش، جسم دھان پان بلکہ بالکل مشتِ استخواں، کلے میں گلوری، بات بات پر تسلیمات بجا لاتا اور دہرا ہوا جاتا ہے۔ بغل میں کاغذوں کا پلندہ جس میں کچھ ادھوری اور کچھ پوری غزلیں، مخاطب کے مذاق اور خیالات کا لحاظ نہیں کرتا جو ملنے آتا ہے، اسے اپنا کلام سنانا شروع کردیتا ہے اور اس وقت تک خاموش نہیں ہوتا، جب تک سننے والا اکتا نہیں جاتا۔

مجھ سے یو۔پی کے ایک مشہور شاعر نے، جو علامہ اقبالؒ سے مل چکا تھا استعجاب کے انداز میں کہا۔ ”اجی صاحب! ڈاکٹر اقبال اپنے لب و لہجے اور ڈیل ڈول سے بالکل پنجابی معلوم ہوتے ہیں۔“ گویا ان لوگوں کے نزدیک اچھے شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے لب و لہجے اور ڈیل ڈول سے پنجابی معلوم نہ ہو۔

ایک دفعہ یو۔پی کے ایک شاعر آئے اور تھوڑی دیر کے بعد علامہ اقبالؒ سے ان کا کلام سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ انھوں نے ٹالنا چاہا، لیکن آپ جانتے ہیں کہ یو۔پی کا شاعر، شعر سننے اور سنانے کے معاملے میں ہمیشہ ”بے پناہ“ ہوتا ہے۔ انھوں نے علامہ مرحوم کے افکار کو شاعرانہ انکسار سمجھا اور برابر تقاضا جاری رکھا، جب یوں کام نہ نکلا تو اپنی ایک غزل سنانی شروع کردی۔ علامہ اقبالؒ کچھ دیر تو چپ چاپ بیٹھے سنتے رہے، لیکن جب دیکھا کہ مدعی داد کا بھی طالب ہے، تو ان سے ضبط نہ ہوسکا۔ صاف کہہ دیا کہ اس قصے کو جانے دیجیے، میں شعر سننے سنانے کا قائل نہیں۔ وہ تھوڑی دیر چپکے بیٹھے رہے، پھر اٹھ کے چلے گئے مگر ان کے تیوروں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہاں سے نکلتے ہی خودکشی کرلیں گے اور اس معاملے میں وہ حق بجانب بھی تھے۔ انھیں یقیناً عمر بھر میں کبھی اس قسم کے شاعر سے سابقہ نہیں پڑا ہوگا۔ جی میں کہتے ہوں گے کہ یہ کیسے شاعر ہیں۔ جو نہ شعر سناتے ہیں، نہ سنتے ہیں، نہ داد لینے کا شوق، نہ داد دینے کا سلیقہ۔

علامہ اقبالؒ جوانی میں کبھی کبھار مشاعروں میں بھی شریک ہوجاتے تھے، لیکن آہستہ آہستہ انھیں اس قسم کے اجتماعات سے نفرت سی ہوگئی۔ ایک دن مشاعروں کا ذکر آ گیا، تو فرمایا اردو شاعری کو ان مشاعروں نے کھویا۔ میں نے پوچھا وہ کیسے؟ کہنے لگے مشاعروں میں بُرے بھلے سب شریک ہوتے ہیں اور داد کو شعر کے حسن و قبح کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری نے عوام کے مذاق کو اپنا رہنما بنالیا۔ میں نے عرض کیا: ”ان مشاعروں نے تو اردو زبان کو بہت فائدہ پہنچایا ہے“۔ فرمایا ”ہاں! زبان کو فائدہ پہنچایا اور شاعری کو غارت کر ڈالا۔“

مرحوم کی طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔ خشک فلسفیانہ مسائل کو بھی وہ لطیفوں اور پھبتیوں سے ایسا دلچسپ بنا دیتے تھے کہ جی چاہتا تھا پہروں بیٹھے ان کی باتیں سنتے رہیں۔ یوں تو ہر روز دو تین لطیفے ہوجایا کرتے تھے، لیکن جو پھبتیاں انھوں نے سر شہاب الدین کے متعلق کہی ہیں انھیں تاریخی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں دیکھ کر علامہ اقبال کو لطیفوں اور پھبتیوں کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ سر شہاب الدین کا رنگ سیاہ تھا۔ ایک دفعہ وہ سیاہ سوٹ پہن کر اسمبلی میں تشریف لے آئے۔ علامہ اقبالؒ

نے انہیں دیکھا، تو ہنس کے فرمایا ’’چودھری صاحب! آج تو آپ ننگے ہی چلے آئے۔‘‘

چودھری صاحب نے غور کیا، تو معلوم ہوا کہ لباس کے انتخاب کا معاملہ نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ سیاہ رنگت پر سیاہ سوٹ واقعی بھلا معلوم نہیں ہوتا۔لوگوں کو یہ معلوم کرنے میں دقت ہوتی ہے کہ کوٹ کا کالر کہاں ہے؟ اور ٹھوڑی کہاں؟ یہ سوچ کے سیاہ سوٹ کے بجائے سپید سوٹ پہننا شروع کردیا۔ علامہ اقبال نے انہیں دیکھا تو سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالی اور بے اختیار ہنس پڑے۔ چودھری صاحب نے جھنجھلا کے کہا۔ ’’آپ ہنستے کیوں ہیں؟‘‘ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ ’’میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ آپ ہیں یا کپاس کے کھیت میں اُرنا بھینسا۔‘‘

ایک مرتبہ بے تکلف احباب کی صحبت میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ چودھری شہاب الدین کا ذکر چھڑ گیا۔ کہنے لگے: ’’میں نے عالم مثال میں ایک بڑھیا دیکھی جو سٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ تو کون ہے؟ کہنے لگی میں طاعون ہوں میں نے کہا، تو بھاگ کے کہاں جا رہی ہے؟ کہنے لگی میں شہر کی طرف جانا چاہتی تھی لیکن وہاں شہاب الدین پہلے ہی موجود ہے۔ میری کیا ضرورت رہ گئی؟‘‘

ایک دن سر شہاب الدین سے کہنے لگے۔ ’’چودھری صاحب آپ سچے مسلمان ہیں۔‘‘ چودھری صاحب نے پوچھا ’’آپ کو کیونکر معلوم ہوا‘‘ کہنے لگے ’’مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے اور بحمداللہ کہ آپ کا ظاہر و باطن یکساں ہے‘‘۔

جن دنوں ابھی چودھری شہاب الدین، نہ سر تھے نہ کونسل کے صدر بلکہ صرف لاہور میونسپلٹی کی صدارت فرماتے اور نرے چودھری جی کہلاتے تھے۔ مہتر صاحب چترال، لاہور تشریف لائے اور یہاں کے معززین نے ان کے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی دی۔ چونکہ علاّمہ اقبال کے سوا مہتر صاحب سے کسی کی شناسائی نہیں تھی، اس لیے مہمان سے میزبانوں کا تعارف کرانے کی خدمت انھیں کے سپرد ہوئی۔ چودھری شہاب الدین کی باری آئی، تو علاّمہ مرحوم نے فرمایا: اعلیٰ حضرت مہتر چترال............ چودھری شہاب الدین۔

اتنا کہہ کے بڑی متانت سے فرمایا۔ ’’ایں ہم مہتر لاہور است‘‘۔

اس قسم کے لطیفے جو صرف چودھری سر شہاب الدین سے متعلق ہیں، ہزاروں نہیں تو کم از کم سیکڑوں ضرور ہیں، لیکن مصیبت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کا انتقال ہوگیا اور چودھری صاحب بتاتے نہیں۔

ان سے ہر قسم کے لوگ ملنے آتے تھے اور وہ سب کی باتیں غور سے سنتے اور ان کا جواب دیتے تھے۔ دوسرے تیسرے روز کالجوں کے کچھ طلبہ بھی آجاتے تھے۔ ان میں سے کوئی ان کے اشعار کے معنی پوچھتا تھا، کوئی مذہب کے متعلق سوالات کرتا تھا۔ کوئی فلسفے کی بحث لے بیٹھتا تھا۔ ایک دفعہ گورنمنٹ کالج کے چار پانچ طالب علم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ جانتے ہیں کہ کالج کی مخلوق میں بننے سنورنے کا شوق زیادہ ہے۔ پوڈر اور سرخی کا استعمال روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ ابروؤں کو خم دینے، زلفوں میں بل ڈالنے، ہونٹوں کو سرخی کے استعمال سے ’’لعلین‘‘ بنانے کا شوق زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک تو یہ چاروں پانچوں گل چہرہ اور نازک اندام، اس پر بناؤ سنگار کا خاص اہتمام۔ انھوں نے آتے ہی پردے کی بحث چھیڑ دی۔ اور ایک نوجوان کہنے لگا: ’’ڈاکٹر صاحب اب مسلمانوں کو پردہ اُٹھا دینا چاہیے‘‘۔

ڈاکٹر صاحب مسکرا کے بولے۔ ’’آپ عورتوں کو پردہ سے نکالنا چاہتے ہیں اور میں اس فکر میں ہوں کہ کالج کے نوجوانوں کو بھی پردہ میں بٹھا دیا جائے۔‘‘

مرحوم زندگی کے بعض معاملات میں خاص ضابطوں کے پابند تھے۔ وہ گھر کا سارا حساب کتاب باقاعدہ رکھتے تھے اور ہر شخص کے خط کا جواب ضرور دیتے تھے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کوئی شخص ان سے کوئی سند یا کسی تصنیف پر ان کی رائے لینے آتا تھا، تو کہتے تھے خود لکھ لاؤ میں دستخط کردوں گا اور یہ بات صرف ٹالنے کی غرض سے نہیں کہتے تھے، بلکہ جو کچھ کوئی لکھ لاتا تھا، اس پر دستخط کردیتے تھے۔ ان کی طبیعت میں بلا کی آمد تھی۔ ایک ایک نشست میں دو دو سو شعر لکھ جاتے تھے۔ پلنگ کے پاس ایک تپائی پر پنسل اور کاغذ پڑا رہتا تھا، جب شعر گوئی پر طبیعت مائل ہوتی تھی، لکھنا شروع کردیتے تھے۔ کبھی خود لکھتے تھے، کبھی کسی کو لکھوا دیتے تھے۔

عشقِ رسولؐ نے ان کے دل کو گداز کر رکھا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام لیتے وقت ان کی آنکھیں پرنم ہوجاتی تھیں اور قرآن پڑھتے پڑھتے بے اختیار رو پڑتے تھے۔ غرض ان کی شخصیت بے حد دلآویز تھی۔ جن لوگوں نے صرف ان کا کلام پڑھا ہے اور ان سے ملے نہیں، تو وہ اقبالؒ کے اعلیٰ کمالات سے بے خبر ہیں۔

موت سے کوئی ڈھائی سال پہلے وہ میو روڈ پر اپنی نوتعمیر کوٹھی میں اٹھ گئے۔ وہاں گئے ابھی تھوڑے دن ہوئے تھے کہ ان کی بیگم صاحبہ کا انتقال ہوگیا۔ انھیں اس واقعے کا بہت صدمہ ہوا۔ میں نے اس حالت میں انھیں دیکھا کہ مرحومہ کی قبر کھودی جارہی ہے اور وہ پیشانی پر ہاتھ رکھے پاس ہی بیٹھے ہیں۔ اس وقت وہ بہت بوڑھے معلوم ہو رہے تھے۔ کمر جھکی ہوئی تھی اور چہرہ زرد۔ اس واقعے کے بعد ان کی صحت برابر بگڑتی چلی گئی۔ آخر ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال کیا اور شاہی مسجد کے باہر دفن ہوئے۔

(مردم دیدہ)

مشق

۱۔ مختصر جوابات لکھیں۔

(الف) علامہ اقبالؒ کے گھر ہونے والی محفلوں کا حال لکھیں۔

(ب) شعر سننے اور سنانے کے معاملے میں یو۔پی کے شعرا کا کیا طرزِ عمل ہے؟

(ج) سر شہاب الدین کون تھے؟

(د) علامہ اقبالؒ کے اُن دوست احباب کے نام لکھیں، جن کا ذکر اس خاکے میں ہے۔

(ہ) ''میں اس فکر میں ہوں کہ کالج کے نوجوانوں کو بھی پردے میں بٹھا دیا جائے۔'' علامہ اقبالؒ نے یہ جملہ کیوں کہا؟

۲۔ اس مضمون میں علامہ اقبالؒ کی زندگی کے جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اُن پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیں۔

۳۔ خالی جگہ پُر کریں:

(الف) اُن دنوں نمک کی ستیاگرہ زوروں پر تھی۔

(ب) موضوع روکھا پھیکا تھا مگر بیچ بیچ میں لطیفے بھی ہو جاتے تھے۔

(ج) وہ جاڑے میں بڑے شوق سے شب دیگ پکواتے تھے۔

(د) علامہ اقبالؒ عام طور پر پنجابی بولتے تھے۔

(ہ) علامہ اقبالؒ کے مطابق مشاعروں نے شاعری کو غارت کر ڈالا۔

۴۔ آپ ''میرے اساتذہ'' کے عنوان پر کم از کم پانچ سو الفاظ کا مضمون تحریر کریں۔ روزمرہ کا خیال رکھیں اور محاورات استعمال کریں۔*

*** محاورہ اور روزمرہ**

جب دو یا دو سے زیادہ الفاظ حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہوں تو وہ محاورہ کہلاتا ہے۔ مثلاً آنکھیں دِکھانا، آنکھوں سے گرانا، نو دو گیارہ ہونا، تارے گننا وغیرہ۔ روزمرہ اہلِ زبان کے بول چال کا نام ہے۔ روزمرہ میں الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ محاورہ قواعد کی حدود میں آتا ہے جب کہ روزمرہ قواعد سے بالاتر ہوتا ہے۔ اسی طرح محاورے میں تبدیلی نہیں ہوتی جب کہ روزمرہ اہل زبان کے مطابق تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

مرکب جملے (۳)

تابع جملے:

اصلی جملے کو خاص جملہ اور ماتحت جملے کو تابع جملہ کہا جاتا ہے۔

تابع جملوں کی تین اقسام ہیں۔

اسمی، وصفی، تمیزی

اسمی جملہ: اس طرح کے جملوں کی ابتدا عموماً ''کہ'' سے ہوتی ہے۔ جیسے:

اُس نے کہا کہ میں بیمار ہوں۔

کون نہیں جانتا کہ وہ ایک شریف آدمی ہے۔

جلسے میں وہ ہلڑبازی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔

کبھی کبھی چھوٹے فقروں اور مقولوں سے ''کہ'' حذف ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

میں نے کہا جاؤ اب نہ آنا۔

کبھی خاص جملہ کی فعل کی وجہ یا مقصد کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے ایسے جملوں میں کبھی کبھی ''کہ'' سے پہلے ''کیوں کہ'' یا ''اس لیے'' بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:

بلب بُجھا دو کہ میں سو سکوں۔

وہ اس بچے سے بڑی محبت کرتا ہے اس لیے کہ وہ اُس کا اکلوتا بیٹا ہے۔

میں باہر جاتے ہوئے ڈرتا ہوں کیوں کہ باہر اندھیرا ہے۔

بعض اوقات تابع جملہ منفی فقرے کے اظہار کے لیے ''ایسا نہ ہو'' کے ساتھ آتا ہے جیسے:

اُن کے بچوں کو تنگ مت کرو ایسا نہ ہو کہ وہ خفا ہو جائے۔

بعض اوقات اسمی جملہ کسی دُعا یا تمنا کے اظہار کے لیے بولا جاتا ہے مثلاً:

مجھے اُمید ہے کہ وہ مجھے میری رقم دے دے گا۔

اللہ کرے کہ میرا بیٹا اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔

تابع جملے میں ناممکن یا محال کا ذکر ہو تو ''کہ'' کی بجائے ''جو'' آئے گا۔ جیسے:

اُس کی کیا مجال ہے جو وہ میرے سامنے ایسی حرکت کرے۔

درج بالا اسمی جملوں میں استعمال ہونے والے تمام حروف سے دو دو جملے بنائیں۔

فارغ بخاری

ولادت: ۱۹۱۷ء

وفات: ۱۹۹۷ء

سید میر احمد شاہ بخاری پشاور میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے اُن کی طبیعت میں جولانی تھی۔ وہ صرف تیرہ سال کی عمر میں ''نوجوان بھارت سبھا'' میں شامل ہوگئے، جس نے تحریکِ آزادی میں متشدّدانہ کردار ادا کیا۔ تحریکِ آزادی اور قیامِ پاکستان کے بعد جمہوریت اور اظہارِ آزادی کے لیے جدوجہد میں بار ہا قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

وہ بنیادی طور پر ایک سکالر اور شاعر تھے۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے تھے۔ اُنھوں نے رضا ہمدانی کے ساتھ مل کر ماہنامہ ''سنگِ میل'' کا اجرا کیا۔ ان دونوں نے پشتو زبان و ادب و ثقافت سے متعلق بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں ادبیاتِ سرحد، پشتو لوک گیت، سرحد کے لوک شاعر، پشتو شاعری اور پشتو نثر شامل ہیں۔ زیر و بم، شیشے کے پیراہن، خوشبو کا سفر، پیاسے ہاتھ، غزلیہ، اور پھُڑا ساول اُن کی شاعری کے مجموعے ہیں۔ اُنھیں ۱۹۹۵ء میں صدارتی ایوارڈ برائے حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔

تصانیف: باچا خان، البم، براتِ عاشقاں (نثر)۔

طائرِ لاہوتی

اہل قلم کو کوزے میں دریا بند کرنے کے سلیقے پر بڑا فخر ہے، لیکن بعض دریا ایسے سرکش ہوتے ہیں کہ انہیں کوزہ تو کیا، سمندر میں بھی بند کرنا محال ہوتا ہے۔ ضیاؔ جعفری مرحوم علم و فضل کے ایسے ہی دریا تھے۔ سیاست سے صحافت تک اور ادب سے تصوف تک ان کی فتوحات کا سلسلہ اس قدر وسیع ہے کہ قدم قدم پر............................

ع کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

غالبؔ نے کہا تھا

ے ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مرگیا ہے، تو جنگل اداس ہے

ضیاؔ کے انتقال سے بھی پشاور پر کچھ ایسی ہی واردات گزری۔ شعر و ادب سے تو وہ سجادہ نشین ہونے کے بعد ہی کٹ چکے تھے، پھر بھی ان کی سرپرستی ادبی حلقوں کے لیے غنیمت تھی۔ ان کی وفات سے تو جیسے ادبی محفلوں کی رونق چھن گئی، دل بجھ گئے۔

وہ بچپن میں ایک چھلاوا اور جوانی میں حشرِ مجسم تھے۔ جس راستے سے گزرتے وہ راستہ قوسِ قزح میں نہا جاتا، جس محفل میں براجمان ہوتے وہ محفل ان کی طلسمی خوشبو سے مہکنے لگتی، جو لباس بھی پہنتے، ان پر یسا پھبتا گویا اُن کے بانکپن سے اس لباس کو زینت ملی ہو............آخری عمر میں ان کی بزرگانہ شفقت، سنِ اخلاق، محبت اور خلوص کے تصور سے میرے دل میں اُس بوڑھے برگد کی یاد جاگ اٹھتی ہے، جو شاہی غ، پشاور کے مغربی کونے میں ایک وسیع رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ کرسیوں والے درخت کے نام سے مشہور

تھا۔ اس لیے کہ اس کے تنے کو تراش کر بڑے سلیقے سے اوپر نیچے بہت سی نشستیں بنا دی گئی تھیں، جہاں گرمیوں کی جھلسا دینے والی دھوپ اور زمہریر سردیوں کی طوفانی ہواؤں اور یخ بستہ فضا سے بچنے کے لیے لوگ اس کے گھمبیر سائے میں پناہ لیتے تھے۔ اس صدیوں پرانے بزرگ برگد سے پشاور شہر کے لوگوں کی دوستی اتنی پختہ ہوگئی تھی کہ جب کسی تعمیر کے سلسلے میں اسے کٹوایا گیا تو اہل شہر کو بڑا شاق ہوا اور وہ اب تک بڑے ارمانوں کے ساتھ اس عظیم درخت کو یاد کرتے ہیں۔

ضیاؔ صاحب کا بڑھاپا بھی ان کے احباب، ان کے شاگردوں اور ان کے ارادت مندوں کے لیے اس سایہ دار برگد سے کم نہ تھا اور ان کی دائمی مُفارقت پر بھی انھوں نے یوں محسوس کیا جیسے ان کا سہارا چھن گیا ہو، جیسے وہ یتیم ہوگئے ہوں۔

ضیا صاحب ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ ہمارا گھر گور گٹھڑی کے دروازے سے ذرا اترائی پر تھا، ضیاؔ اس کے جنوبی گنبد کے بالمقابل چڑھائی پر رہتے تھے۔ میں بچپن سے دو سرخ و سپید، سروقد نوجوانوں کو کبھی کبھی اس سڑک پر خراماں خراماں گزرتے دیکھتا، ایک عرصے کے بعد جب میں نے ہوش سنبھالا تو پتا چلا کہ یہ حضرات یہاں کے مشہور شاعر ضیاؔ جعفری اور عبدالودود قمرؔ ہیں۔

میں نے اس شاعرانہ ماحول میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی اپنے اندر کوئی غیر معمولی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ جہاں کسی شاعر کا نام سنا، بے اختیار دل اس کی طرف کھنچنے لگا۔

ع اس خاک کے ذروں میں شراروں کا شرف تھا

ضیاؔ اور قمرؔ کے شاعر ہونے کا اِنکشاف بھی ان دو خوبرو نوجوانوں سے میری دلچسپی کا باعث بن گیا، لیکن اس وقت میری عمر اتنی کچی تھی کہ ان سے دوستی کا ارمان پورا نہ ہوسکا۔

۱۹۳۵ء میں رضاؔ بھائی نے ضیاؔ جعفری سے تعارف کرایا، تو میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے ہاتھ ملایا۔ یہ باغ و بہار انسان پہلی صحبت ہی میں یوں گھل مل گیا، جیسے برسوں کی شناسائی ہو، رندی و سرمستی سے لے کر شعر و ادب، فلسفہ اور تصوف تک، ہر موضوع پر ان کی باتیں اتنی دلچسپ اور فکر انگیز تھیں کہ میں تو جیسے

مسحور ہو کر رہ گیا۔

صوبہ سرحد میں اردو ادب کے دورِ جدید کا آغاز دائرۂ ادبیہ کے قیام سے ہوا۔ یہ ادارہ ضیا جعفری اور قمر صاحب کی مثالی دوستی کی یادگار تھا۔ اس تنظیم میں نذیر مرزا برلاس، مظہر گیلانی، مبارک جبین عاجز، اسیر انور ضیائی، مضطر تاتاری، جگر کاظمی اور خالص ملکی شامل تھے۔ میری حیثیت اس وقت ایک مبتدی کی تھی۔ دائرۂ ادبیہ میں پہنچ کر ضیا کی شفقت اور توجہ سے بہت کچھ سیکھا۔ وہاں کے علمی و ادبی ماحول نے مجھ میں خود اعتمادی پیدا کی، وہاں کی تربیت نے مجھے روشنی عطا کی اور میرے اندر تخلیق کی سچی لگن کو جنم دیا۔

ضیا کی شخصیت بھڑکیلے اور چکا چوند پیدا کرنے والے رنگوں کا مجموعہ تھی۔ ہر رنگ مہکتا ہوا، دھڑکتا ہوا۔ سیاست میں وہ یہاں "نوجوان بھارت سبھا" کے بانیوں میں سے تھے۔ صحافت میں وہ ۱۹۳۰ء میں روزنامہ "انگار" کے ایڈیٹر رہے اور ان کے ساتھ عبدالودود قمر نائب مدیر تھے۔ اس کے بعد بھی آپ متعدد اخباروں کی ادارت کرتے رہے۔ ادب میں وہ ایسی دلآویز شخصیت تھے۔ جسے ادبیاتِ سرحد کی تاریخ کا سنہری باب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ یہاں جدید ادبی دور کے سالارِ کارواں تھے۔ اردو اور فارسی کے نامی گرامی شاعر تھے، دونوں زبانوں میں رباعی میں وہ نام کمایا کہ "خیامِ سرحد" کہلائے۔ غزل پر بھی بڑی دسترس حاصل تھی اور یہاں نظم کو رواج دینے میں بھی اُن کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ نثر میں تنقید، ڈرامہ، ریڈیائی فیچر سب کچھ لکھا۔ نئی نسل میں اس خطے کے تمام مشہور شعرا و ادبا کی فنی تربیت میں بھی آپ کا بڑا حصہ ہے۔

صوفی منش ہونے کے سبب روشن خیال اور وسیع المشرب واقع ہوئے تھے۔ پشاور سے بریلی تک آپ کے عقیدت مندوں کا حلقہ پھیلا ہوا تھا۔ دائرۂ ادبیہ کا چھوٹا سا دفتر، جو محلّہ شاہ ولی قتال قصہ خوانی میں واقع تھا، ضیا کی ہمہ رنگ شخصیت کا آئینہ دار تھا، جہاں ادیبوں، سیاستدانوں، آرٹسٹوں، صحافیوں، مجذوبوں اور علما و فضلا کا ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا۔

ادیبوں سے شعر و ادب پر بحث کرتے کرتے یکا یک جیسے ضیا کے اندر گھنٹی بجتی اور سیاست کا پیریڈ شروع ہو جاتا۔ اسی طرح آرٹ کا، صحافت کا پیریڈ بدلتا رہتا اور پھر اچانک "یاہو" کا نعرہ لگاتے ہی وہ

آنکھیں بند کر کے اپنے اندر ڈوب جاتے اور گھنٹوں دفتر کے ایک گوشے میں بیٹھے مراقبے میں نظر آتے۔ اسی اعتبار سے ہم انہیں "طائرِ لاہوتی" کہنے لگے۔ وہ زاہدِ خشک نہیں تھے۔ رنگین مزاج زندہ دلی کا مجسمہ، سنجیدہ سے سنجیدہ گفتگو میں ان کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھتی، تو ایک ایسا فقرہ جڑ دیتے کہ حاضرین حیران و پریشان اُن کا منھ تکنے لگتے۔

ضیا صاحب اور ان کے ساتھی عبدالودود قمر کی دوستی سارے شہر میں ضرب المثل بن چکی تھی، وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ حسنِ اتفاق کہ دونوں ادب کے رسیا بھی تھے، دونوں کو تصوف کی چاٹ بھی تھی اور سیاست کی بھی۔ البتہ ان کے سیاسی نظریات خاصے مختلف تھے اور یہی اختلاف بسا اوقات ان کے مابین محاذ آرائی کا سبب بنتا۔ قمر صاحب سے ان کی نوک جھونک اکثر لڑائی کا پیش خیمہ بن جاتی۔ ضیا صاحب بھری محفل میں ان پر برسنے لگتے۔ قمر صاحب جذباتی اور تند مزاج ہونے کے باوجود ضیا صاحب کا بے حد احترام کرتے، جب ضیا صاحب کا پارہ چڑھ جاتا، تو دبک جاتے اور لطف یہ کہ تھوڑی دیر ہی میں وہ پھر اسی طرح ہنستے بولتے اور چُہلیں کرتے دکھائی دیتے۔

یہ چاند سورج کی جوڑی صوبہ سرحد میں اردو زبان و ادب کی ترویج کے لیے نیک فال ثابت ہوئی۔ دائرۂ ادبیہ میں ان دونوں ساتھیوں کی سنگت سے جدید ادب کا یہ پودا جلد ہی پھولنے پھلنے لگا۔ ضیا بڑے شاعر اور ادیب تھے، ان کی رنگا رنگ شخصیت کی جاذبیت اور فن کے جادو کے زور سے نئی نسل کے شاعر، ادیب ان کی طرف کھنچے چلے آتے، لیکن انتظامی امور میں وہ بالکل کورے تھے۔ خلاف اس کے قمر بڑے قلمکار نہ سہی، لیکن انتظامی اہلیت میں علامہ ہیں۔ وہ ایک ان تھک کام کرنے والے عملی انسان ہیں۔ دائرۂ ادبیہ کے لیے چندہ جمع کرنے کے علاوہ مشاعروں کا اہتمام، پبلسٹی کا انتظام اور مہمانوں کی مدارت تک ان کے ذمہ تھی، وہ ایسے کھرے اور بااصول انسان ہیں، جن کی بے رحم صاف گوئی سے اپنا بیگانہ کوئی محفوظ نہیں۔ اسی اصول کے تحت انھوں نے اس ادارے کو نظم و ضبط کے اعتبار سے ایک مثالی ادارہ بنا دیا تھا۔ سب ان کا احترام

کرتے اور ان کی تلخ کلامی کو ہنسی خوشی برداشت کرتے تھے۔ مسلّمہ حقیقت ہے کہ ضیا کی ادبی شہرت و قبولیت قمر کی رہینِ منت تھی اور اسے مسندِ ارشاد کے مقام تک پہنچانے میں قمر کی مخلصانہ کوششوں کا بڑا حصّہ ہے۔

ضیا دائرہ ادبیہ کے صدر تھے، قمر ناظمِ اعلیٰ اور کرتا دھرتا تھے، ان کا رعب مجھ پر ہمیشہ اس قدر غالب رہا کہ کبھی بے تکلف ہونے یا کھُل کر بات کرنے کی آج تک جرأت نہ ہوسکی۔ وہ بحیثیت سید میرا احترام بھی شرمسار کرنے کی حد تک کرتے، لیکن ذرا سی غلطی یا فروگذاشت پر بری طرح ڈانٹ بھی دیتے۔ قمر صاحب سے بظاہر استادی شاگردی کا ناتا نہیں تھا، لیکن درحقیقت مجھے نثر میں قلم پکڑنا انھوں نے ہی سکھایا۔ مشاعروں کی روداد لکھواتے، اس کی تصحیح کرتے، زبان، محاورے اور روزمرہ کی غلطیوں کی طرف توجہ دلاتے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے سامنے خاصی احتیاط برتنا پڑتی۔ یہی نہیں بلکہ محفل میں اٹھنے بیٹھنے، بات کرنے اور پڑھنے کے آداب سکھانے میں بھی وہ بڑی سختی برتتے۔ ذرا سی بے احتیاطی پر اتنی سخت جھاڑ ملتی کہ آئندہ کبھی بھول کر بھی کوئی لغزش نہ ہوتی۔ ان کی عقابی نظریں ہمیشہ ہماری حرکات وسکنات کا جائزہ لیتی رہتیں۔ نوجوانی کا عالم تھا کبھی بے جوڑ لباس پہن کر آجاتے، تو مذاق مذاق میں خجل کرتے۔ یہ کیا بیہودہ لباس پہنا ہے، لوگ کیا کہیں گے کہ شاعر ادیب ہو کر لباس پہننے کی تمیز نہیں۔ غرض انھوں نے ہر نہج پر ہماری تہذیب و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ آج ہم فخر سے یہ کہہ سکتے ہیں............

ع ہم ہوئے جو کچھ، وہاں رہ کر ہوئے

حوصلہ افزائی کا یہ عالم کہ میں جو اس ادبی ماحول میں طفلِ مکتب بھی نہ تھا، چند دنوں ہی میں قمر صاحب نے مجھے لائبریرین بنا دیا۔ یہ میرے لیے اُس وقت اتنا بڑا اعزاز تھا کہ پھولے نہ سمایا اور نہایت ذوق وشوق سے اس مختصر سی لائبریری کی ترتیب میں منہمک رہنے لگا۔ پھر اگلے سال نائب ناظم کی ذمہ داری سونپ دی گئی، جسے نبھانے کے لیے اور خود کو اہل ثابت کرنے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑے۔

ضیا کی شخصیت جمالیات کا مظہر تھی۔ اللہ والے تھے۔ بٹالہ شریف کی گدی کے مرید تھے، حج کر کے آئے، تو سجادہ نشین بن گئے۔ سجادہ نشین بنتے ہی ان کے مریدوں میں اضافہ ہوتا گیا، پشاور سے کراچی تک پھیل گئے اور یہ مصروفیت اتنی بڑھی کہ وہ ادب اور ادبی دنیا سے یکسر کٹ کر رہ گئے۔ کبھی کبھی نعت یا منقبت کہ لیتے، البتہ جب بھی ملاقات ہوتی، کہتے غزلیں سناؤ، جھوم جھوم کر سنتے اور داد دیتے۔

ہارٹ اٹیک ہوا، کئی دن سے ان کی حالت اچھی نہ تھی۔ میں کراچی مشاعرہ پڑھنے جا رہا تھا۔ جانے سے ایک دن پہلے خاطر کے ساتھ انھیں دیکھنے گیا۔ بڑے ہشاش بشاش نظر آرہے تھے، چہرے پر وہی سرخی، طبیعت میں وہی شوخی اور اس کے بعد جو ضیا صاحب فارم میں آئے، تو اس طرح چہکنے لگے کہ معلوم ہوتا تھا کبھی بیمار تھے ہی نہیں۔ ماضی کے واقعات ایک ایک کر کے یاد کرتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ مشاعروں کے لطیفے، اپنی حماقتیں، دوستوں کی رقابتیں، چشمکیں، مجادلے، مناظرے اور مہم جوئی کے حالات، یوں لگتا جیسے عہدِ رفتہ کی کتاب کھُل گئی ہو، اُس وقت ان کی گل افشانی تقریر دیدنی تھی، یہاں تک کہ دوپہر سے شام ہوگئی اور ہم جب رخصت ہونے لگے تو بادل نخواستہ انھوں نے خدا حافظ کہا۔

میں چار پانچ دن کے بعد کراچی سے لوٹا، تو گھر میں داخل ہوتے ہی بچوں نے ضیا صاحب کے انتقال کی روح فرسا خبر سنائی۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ چہکتا مہکتا ضیا ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگیا ہے۔

ضیا ادبیاتِ سرحد کا ایک رنگین باب تھا، وہ ایک مکتبۂ فکر، ایک تحریک تھا، اُن کی ادبی و علمی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اُنھوں نے یہاں علم وادب کے چراغ روشن کیے، ان کی روشنی اور اس سدا بہار پھول کی خوشبو ہمیشہ دلوں کو مُنوّر کرتی اور مہکاتی رہے گی۔

(البم)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

(الف) مصنف نے ضیا جعفری کو بوڑھے برگد سے کیوں تشبیہ دی؟

(ب) ضیا جعفری کا گھر کہاں واقع تھا؟

(ج) دائرۂ ادبیہ میں کون کون شامل تھے؟

(د) عبدالودود قمر کون تھے؟

(ہ) قمر صاحب دائرہ کے اصول وضوابط کیسے برقرار رکھتے تھے؟

(و) شاعروں کے بارے میں مصنف کے کیا جذبات تھے؟

۲۔ خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) ضیا جعفری ایسے دریا تھے جنھیں ______ میں بند کرنا بھی محال تھا۔

(ب) محفل اُن کی طلسمی خوشبو سے ______ لگتی۔

(ج) جب میں نے ______ سنبھالا تو پتا چلا کہ یہ دونوں حضرات مشہور شاعر ہیں۔

(د) ضیا جعفری روشن خیال اور ______ تھے۔

(ہ) ضیا اور قمر کی دوستی سارے شہر میں ______ تھی۔

(و) درحقیقت مجھے قلم ______ قمر صاحب نے ہی سکھایا۔

(ز) سنجیدہ گفتگو میں بھی اُن کی رگِ ظرافت ______ اُٹھتی۔

۳۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگائیں اور الفبائی ترتیب سے لکھیں۔

نظم وضبط، مشاعرہ، مقالات، تلخ کلامی، جاذبیت۔

۴۔ درج ذیل جملوں میں مناسب مقامات پر رموزِ اوقاف لگائیں۔

(الف) عمران خان نے جو پاکستان کا نامور فرزند ہے کینسر ہسپتال بنایا۔

(ب) جھیل سیف الملوک تک جو سارا پہاڑی علاقہ ہے سفر آسان نہیں ہے۔

(ج) سنو کیا تم میری مدد کرو گے۔

(د) ماشاء اللہ کتنی ذہین بچی ہے۔

(ہ) بچے بولے ماموں جان آگئے۔

۵۔ درج ذیل جملوں کو قواعد کے مطابق درست کریں۔

(الف) نیز شاعر کا نام بھی لکھیں۔

(ب) ہمارا گھر شہر میں واقعہ ہے۔

(ج) بزرگوں کی بات کو غور سے سنو۔

(د) تم کب واپس لوٹو گے۔

(ہ) تم نے کیوں شور ڈالا ہے۔

(و) میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔

۶۔ اس سبق میں سے محاورات کی نشان دہی کریں۔

* کل گدھے پر جا کر نظم پڑھنا اور بیس روپے کا چیک لانا۔

ایسا کلام کہنا جس کے دو معنی نکل سکتے ہوں اور دونوں ایک دوسرے کے برعکس ہوں متحمل العذین کہلاتا ہے۔ مثلاً اس جملے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ کل جانا اور "گدھے" پر نظم پڑھنا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ گدھے پر بیٹھ کر جانا اور نظم پڑھنا۔ اس طرح کی پانچ مثالیں تلاش کر کے لکھیں۔

پطرس بخاری

ولادت: ۱۸۹۸ء | وفات: ۱۹۵۸ء

پطرس بخاری کا اصل نام سید احمد شاہ بخاری اور والد کا نام سید اسد اللہ تھا۔ پطرس بخاری پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پشاور سے حاصل کرنے کے بعد لاہور چلے گئے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم۔اے کیا اور پھر کیمبرج یونیورسٹی انگلینڈ سے آنرز کیا۔ واپس آکر کچھ عرصے گورنمنٹ کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ آل انڈیا ریڈیو کے قیام کے بعد وہ ریڈیو سے منسلک ہوکر دہلی چلے گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد واپس لاہور آئے تو اُنھیں گورنمنٹ کالج لاہور کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ پطرس بخاری اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بُوتے پر ترقی کرتے گئے اور یو۔این۔او (اقوامِ متحدہ) میں پاکستان کے مندوب مقرر ہوئے۔ اچانک حرکتِ قلب بند ہونے کی وجہ سے یہ مایۂ ناز مزاح نگار اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔

پطرس مرحوم کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ لیکن اُن کی ایک مختصر سی کتاب ”پطرس کے مضامین“ نے اُنھیں وہ شہرت عطا کی کہ وہ اُردو ادب کی تاریخ میں زندۂ جاوید ہوگئے۔ اُن کی تحریریں اُن کی شگفتہ شخصیت، وسیع مطالعہ اور عالمی ادب سے شناسائی کی عکاس ہیں۔ اُن کی طبعی بے تکلفی اور علمی بصیرت ہر جگہ گُل کھلاتی ہے۔ روزمرّہ زندگی سے مزاح کے پہلو تلاش کرنا اُن کے لیے معمول کی بات ہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز سے ہماری مزاحیہ حس کو متحرک کرتے چلے جاتے ہیں۔ بلا شبہ وہ نہ صرف ایک عظیم انسان بلکہ عظیم فنکار بھی تھے۔

تصانیف: کلیاتِ پطرس نثر۔ پطرس کے مضامین

مرید پور کا پیر

اکثر لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ میں اپنے وطن کا ذکر کبھی نہیں کرتا۔ بعض اس بات پر بھی حیران ہیں کہ میں اب کبھی اپنے وطن کو نہیں جاتا۔ جب کبھی لوگ مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میں ہمیشہ بات ٹال دیتا ہوں۔ اس سے لوگوں کو طرح طرح کے شبہات ہونے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے: وہاں اس پر ایک مقدمہ بن گیا تھا۔ اس کی وجہ سے روپوش ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ وہاں کہیں ملازم تھا۔ غبن کا الزام لگا۔ ہجرت کرتے ہی بنی۔ کوئی کہتا ہے: والد اس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے گھر میں نہیں گھسنے دیتے۔ غرض یہ کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ آج میں ان سب غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والا ہوں۔ خدا آپ پڑھنے والوں کو انصاف کی توفیق دے۔

قصہ میرے بھتیجے سے شروع ہوتا ہے۔ میرا بھتیجا یوں دیکھنے میں عام بھتیجوں سے مختلف نہیں۔ میری تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں اور اس کے علاوہ نئی پود سے تعلق رکھنے کے باعث اس میں بعض فالتو اوصاف نظر آتے ہیں لیکن ایک صفت تو اس میں ایسی ہے کہ آج تک ہمارے خاندان میں اس شدت کے ساتھ کبھی رونما نہ ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ بڑوں کی عزت کرتا ہے اور میں اس کے نزدیک بس علم وفن کا ایک دیوتا ہوں۔ یہ خبط اس کے دماغ میں کیوں سمایا ہے؟ اس کی وجہ میں یہی بتا سکتا ہوں کہ نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں میں بھی کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آجاتا ہے۔ میں نے شائستہ سے شائستہ دودمانوں کے فرزندوں کو بعض اوقات بزرگوں کا اس قدر احترام کرتے دیکھا ہے کہ اُن پر نیچ ذات کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔

ایک سال مَیں کانگریس کے جلسے میں چلا گیا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کانگریس کا جلسہ میرے پاس چلا آیا۔ مطلب یہ کہ جس شہر میں، مَیں موجود تھا وہیں کانگریس والوں نے بھی اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے

کی ٹھان لی۔ میں پہلے بھی اکثر جگہ یہ اعلان کرچکا ہوں اور اب بھی بہانگِ دُہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہ تھا۔ بعض لوگوں کو یہ شک ہے کہ میں نے محض اپنی تسکینِ نخوت کے لیے کانگریس کا جلسہ اپنے پاس ہی کرالیا۔ لیکن یہ محض حاسدوں کی بدنیتی ہے۔ بھانڈوں کو میں نے اکثر شہر میں بلوایا ہے۔ دو ایک مرتبہ بعض تھیٹروں کو بھی دعوت دی ہے لیکن کانگریس کے مقابلے میں میرا رویہ ہمیشہ ایک گمنام شہری کا سا رہا ہے۔ بس اس سے زیادہ میں اس موضوع پر کچھ نہ کہوں گا۔

جب کانگریس کا سالانہ اجلاس بغل میں ہو رہا ہو تو کون ایسا متقی ہوگا جو وہاں جانے سے گریز کرے۔ زمانہ بھی تعطیلات اور فرصت کا تھا۔ چنانچہ میں نے شغلِ بیکاری کے طور پر اس جلسے کی ایک ایک تقریر سنی۔ دن بھر تو جلسے میں رہتا۔ رات کو گھر آکر اس دن کے مختصر سے حالات اپنے بھتیجے کو لکھ بھیجتا تاکہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔

بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھتیجے صاحب میرے ہر خط کو بے حد ادب و احترام کے ساتھ کھولتے بلکہ بعض بعض باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس افتتاحی تقریب سے پیشتر وہ باقاعدہ وضو بھی کر لیتے۔ خط کو خود پڑھتے۔ پھر دوستوں کو سناتے پھر اخباروں کے ایجنٹ کی دکان پر مقامی لال بجھکڑوں کے حلقے میں اس کو خوب بڑھا چڑھا کر دُہراتے۔ پھر مقامی اخبار کے بے حد مقامی ایڈیٹر کے حوالے کردیتے۔ جو اسے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپ دیتا۔ اس اخبار کا نام "مرید پور گزٹ" ہے۔ اس کی مکمل فائل کسی کے پاس موجود نہیں۔ وہ مہینے تک جاری رہا۔ پھر بعض مشکلات کی وجہ سے بند ہوگیا۔ ایڈیٹر صاحب کا حلیہ حسب ذیل ہے۔

رنگ گندمی، گفتگو فلسفیانہ، شکل سے چور معلوم ہوتے ہیں۔ کسی صاحب کو ان کا پتہ معلوم ہو تو مرید پور کی خلافت کمیٹی کو اطلاع پہنچا دیں اور عند اللہ ماجور ہوں نیز کوئی صاحب ان کو ہرگز ہرگز کوئی چندہ نہ دیں ورنہ خلافت کمیٹی ذمہ دار نہ ہوگی۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس اخبار نے میرے ان خطوط کے بل پر اپنا ایک "کانگریس نمبر" بھی نکال مارا۔ جو اتنی بڑی تعداد میں چھپا کہ اس کے اوراق اب تک بعض پنساریوں کی دکانوں پر نظر آتے ہیں۔

بہرحال مرید پور کے بچے بچے نے میری قابلیت، انشا پردازی، صحیح الدماغی اور جوشِ قومی کی داد دی۔ میری اجازت اور میرے علم کے بغیر مجھے مرید پور کا قومی لیڈر قرار دیا گیا۔ ایک دو شاعروں نے مجھ پر نظمیں بھی لکھیں جو وقتاً فوقتاً مرید پور گزٹ میں چھپتی رہیں۔

میں اپنی اس عزت افزائی سے محض بے خبر تھا۔ سچ ہے: خدا جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں نے اپنے بھتیجے کو محض چند خطوط لکھ کر اپنے ہم وطنوں کے دل میں اس قدر گھر کرلیا ہے اور کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی سا انسان جو ہر روز چپ چاپ سر نیچا کیے بازار میں سے گزر جاتا ہے۔ مرید پور میں پوجا جاتا ہے۔ میں وہ خطوط لکھنے کے بعد کانگریس اور اس کے تمام متعلقات کو قطعاً فراموش کرچکا تھا۔ مرید پور گزٹ کا میں خریدار نہ تھا۔ بھتیجے نے میری بزرگی کے رعب کی وجہ سے کبھی بر سبیلِ تذکرہ اتنا بھی نہ لکھ بھیجا کہ آپ لیڈر ہوگئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے یوں کہتا تو برسوں تک اس کی بات میری سمجھ میں نہ آتی۔ لیکن بہرحال مجھے کچھ تو معلوم ہوتا کہ میں ترقی کر کے کہاں سے کہاں تک پہنچ چکا ہوں۔

کچھ عرصے بعد خون کی خرابی کی وجہ سے ملک میں جا بجا جلسے نکل آئے جس کسی کو ایک میز ایک کرسی اور ایک گلدان میسر آیا۔ اسی نے جلسے کا اعلان کردیا۔ جلسوں کے اس موسم میں ایک دن مرید پور کی ''انجمن نوجوانانِ ہند'' کی طرف سے میرے نام اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا۔ کہ آپ کے شہر کے لوگ آپ کے دیدار کے منتظر ہیں۔ ہر کہ وَمہ آپ کے روئے انور کو دیکھنے اور آپ کے پاکیزہ خیالات سے مستفید ہونے کے لیے بے تاب ہے۔ مانا ملک بھر کو آپ کی ذاتِ بابرکات کی از حد ضرورت ہے لیکن وطن کا حق سب سے زیادہ ہے۔ کیونکہ:

ع   خارِ وطن از سنبل وریحاں خوشتر

اسی طرح کی تین چار براہینِ قاطع کے بعد مجھ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ آپ یہاں آکر لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کریں۔

خط پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی لیکن جب ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیا تو رفتہ رفتہ

باشندگانِ مرید پور کی مردم شناسی کا قائل ہوگیا۔

میں ایک کمزور انسان ہوں اور پھر لیڈری کا نشہ ایک لمحہ ہی میں چڑھ جاتا ہے۔ اس ایک لمحے کے اندر مجھے اپنا وطن بہت ہی پیارا معلوم ہونے لگا۔ اہلِ وطن کی بے حسی پر بڑا ترس آیا۔ ایک آواز نے کہا کہ ان بچاروں کی بہبودی اور رہنمائی کا ذمہ دار تو ہی ہے۔ تجھے خدا نے تدبّر کی قوت بخشی ہے۔ ہزار ہا انسان تیرے منتظر ہیں۔ اٹھ کہ سیکڑوں لوگ تیرے لیے ماحضر لیے بیٹھے ہوں گے۔ چنانچہ میں نے مرید پور کی دعوت قبول کرلی اور لیڈرانہ انداز میں بذریعہ تار اطلاع دی کہ پندرہ دن کے بعد فلاں ٹرین سے مرید پور پہنچ جاؤں گا۔ سٹیشن پر کوئی شخص نہ آئے۔ ہر ایک شخص کو چاہیے کہ اپنے اپنے کام میں مصروف رہے۔ ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد جلسے کے دن تک میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ہونے والی تقریر کی تیاری میں صرف کردیا۔ طرح طرح کے فقرے دماغ میں صبح وشام پھرتے رہے۔

"ہندو اور مسلم بھائی بھائی ہیں۔"

"ہندو اور مسلم شیر وشکر ہیں۔"

"ہندوستان کی گاڑی کے دو پہیے۔ اے میرے دوستو! ہندو اور مسلمان ایک ہی تو ہیں"

"جن قوموں نے اتفاق کی رسی کو مضبوط پکڑا۔ وہ اس وقت تہذیب کے نصف النہار پر ہیں۔ جنھوں نے نفاق اور پھوٹ کی طرف رجوع کیا۔ تاریخ نے ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں"۔ وغیرہ وغیرہ۔

بچپن کے زمانے میں کسی درسی کتاب میں "سنا ہے کہ دو بیل رہتے تھے اک جا" والا واقعہ پڑھا تھا۔ اسے نکال کر نئے سرے سے پھر پڑھا اور اس کی تمام تفصیلات کو نوٹ کر لیا۔ پھر یاد آیا کہ ایک اور کہانی بھی پڑھی تھی۔ جس میں ایک شخص مرتے وقت اپنے تمام لڑکوں کو بُلا کر لکڑیوں کا ایک گٹھا ان کے سامنے رکھ دیتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس گٹھے کو توڑو۔ وہ توڑ نہیں سکتے پھر اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک

لکڑی ان سب کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ جسے وہ آسانی سے توڑ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اتفاق کا سبق اپنی اولاد کے ذہن نشین کراتا ہے۔ اس کہانی کو بھی لکھ لیا۔ تقریر کا آغاز سوچا تو کچھ اس طرح کی تمہید مناسب معلوم ہوئی کہ

پیارے ہم وطنو!

گھٹا سر پہ اِدبار کی چھا رہی ہے
فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے
یہ چاروں طرف سے نِدا آرہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

ہندوستان کے جس مایۂ ناز شاعر یعنی مولانا الطاف حسین حاؔلی پانی پتی نے آج سے کئی برس پیشتر یہ اشعار قلم بند کیے تھے اس کو کیا معلوم تھا کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا، اس کے یہ الم ناک الفاظ روز بروز صحیح تر ہوتے جائیں گے۔ آج ہندوستان کی یہ حالت ہے............ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد سوچا کہ ہندوستان کی حالت کا ایک درد ناک نقشہ کھینچوں گا۔ افلاس، غربت اور بغض وغیرہ کی طرف اشارہ کروں گا۔ اور پھر پوچھوں گا کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ ان تمام وجوہ کو دہراؤں گا جو لوگ اکثر بیان کرتے ہیں۔ مثلاً غیر ملکی حکومت، آب وہوا اور مغربی تہذیب لیکن ان سب کو باری باری غلط قرار دوں گا اور پھر اصلی وجہ بتاؤں گا کہ اصلی وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے۔ آخر میں اتحاد کی نصیحت کروں گا اور تقریر کو اس شعر پر ختم کروں گا کہ

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

دس بارہ دن اچھی طرح غور کر لینے کے بعد میں نے اس تقریر کا ایک خاکہ سا بنا لیا اور اس کو ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا تا کہ جلسے میں اسے اپنے سامنے رکھ سکوں۔ وہ خاکہ کچھ اس طرح کا تھا۔

۱۔ تمہید۔ اشعار حالیؔ (بلند اور دردناک آواز سے پڑھو)

۲۔ ہندوستان کی موجودہ حالت

(الف) افلاس

(ب) بغض

(ج) قومی رہنماؤں کی خود غرضی

۳۔ اس کی وجہ

کیا غیر ملکی حکومت ہے؟ نہیں

کیا آب وہوا ہے؟ نہیں

کیا مغربی تہذیب ہے؟ نہیں

تو پھر کیا ہے؟ (وقفہ جس کے دوران میں مسکراتے ہوئے تمام حاضرینِ جلسہ پر ایک نظر ڈالو)

۴۔ پھر بتاؤ کہ وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے۔ (نعروں کے لیے وقفہ) اس کا نقشہ کھینچو۔ فسادات وغیرہ کا ذکر رقت انگیز آواز میں کرو۔

(اس کے بعد شاید چند نعرے بلند ہوں۔ ان کے لیے ذرا ٹھہر جاؤ)

۵۔ خاتمہ۔ عام نصائح۔ خصوصاً اتحاد کی تلقین (شعر)

اس کے بعد انکسار کے انداز میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤں اور لوگوں کی داد کے جواب میں ایک ایک لمحے کے بعد حاضرین کو سلام کرتے رہو)

اس خاکے کو تیار کر چکنے کے بعد، جلسے کے دن تک ہر روز اس پر ایک نظر ڈالتا رہا اور آئینے کے

سامنے کھڑے ہو کر بعض معرکۃ الآرا فقروں کی مشق کرتا رہا۔ نمبر۳ کے بعد کی مسکراہٹ کی خاص مشق بہم پہنچائی۔ کھڑے ہو کر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومنے کی عادت ڈالی تا کہ تقریر کے دوران میں آواز سب طرف پہنچ سکے اور سب لوگ اطمینان کے ساتھ ایک ایک لفظ سن لیں۔

مرید پور کا سفر آٹھ گھنٹے کا تھا۔ رستے میں سانگا کے سٹیشن پر گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔ ''انجمن نوجوانان ہند'' کے بعض جوشیلے ارکان وہاں استقبال کو آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہار پہنائے اور کچھ پھل وغیرہ کھانے کو دیئے۔ سانگا سے مرید پور تک ان کے ساتھ اہم سیاسی مسائل پر بحث کرتا رہا۔ جب گاڑی مرید پور پہنچی تو سٹیشن کے باہر کم از کم تین ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا جو متواتر نعرے لگا رہا تھا۔ میرے ساتھ جو والنٹیر تھے۔ انھوں نے کہا '' سر باہر نکالیے۔ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں''۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ہار میرے گلے میں تھے ایک سنگترہ میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھا تو لوگ اور بھی جوش کے ساتھ نعرہ زن ہوئے۔ بمشکل تمام باہر نکلا۔ موٹر میں مجھے سوار کرایا گیا اور جلوس، جلسہ گاہ کی طرف چلا۔

جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو ہجوم پانچ چھے ہزار تک پہنچ چکا تھا۔ جو یک آواز ہو کر میرا نام لے لے کر نعرے لگا رہا تھا۔ دائیں بائیں سرخ سرخ جھنڈوں پر مجھ خاکسار کی تعریف میں چند کلمات بھی درج تھے۔ مثلاً ہندوستان کی نجات تمھیں سے ہے''۔ '' مرید پور کے فرزند خوش آمدید''۔ '' ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے''۔

مجھ کو اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ صدرِ جلسہ نے لوگوں کے سامنے مجھ سے بغل گیر ہو کر میری پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر اپنی تعارفی تقریر یوں شروع کی:

'' حضرات! ہندوستان کے جس نامی اور بلند پایہ لیڈر کو آج کے جلسے میں تقریر کے لیے بلایا گیا ہے.............''۔

تقریر کا لفظ سن کر میں نے اپنی تقریر کے تمہیدی فقروں کو یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اس وقت ذہن اس قدر مختلف تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ نوٹ دیکھنے کی ضرورت پڑی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو

نوٹ ندارد۔ ہاتھ پاؤں میں یکلخت ایک خفیف سی خنکی محسوس ہوئی۔ دل کو سنبھالا کہ ٹھہرو، ابھی اور کئی جیبیں ہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ رعشے کے عالم میں سب جیبیں دیکھ ڈالیں لیکن وہ کاغذ نہ ملا۔ تمام ہال آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا۔ دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کیا۔ ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے۔ دس بارہ دفعہ تمام جیبوں کو ٹٹولا لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کردوں۔ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگا۔ صدر جلسہ اپنی تقریر برابر کر رہے تھے۔

''مرید پور کا شہران پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ ہر صدی اور ہر ملک میں صرف چند ہی ایسے اشخاص پیدا ہوتے ہیں جن کی ذات، نوعِ انسان کے لیے..........''۔

خدایا اب میں کیا کروں؟ ایک تو ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچنا ہے۔ نہیں، اس سے پہلے یہ بتانا ہے کہ ہم کتنے نالائق ہیں۔ نالائق کا لفظ تو غیر موزوں ہوگا۔ جاہل کہنا چاہیے۔ یہ بھی ٹھیک نہیں۔ غیر مہذب۔

''..........ان کی اعلیٰ سیاست دانی۔ ان کا قومی جوش اور مخلصانہ ہمدردی سے کون واقف نہیں۔ یہ سب باتیں تو خیر آپ جانتے ہیں لیکن تقریر کرنے میں جو ملکہ ان کو حاصل ہے..........''

ہاں وہ تقریر کا ہے سے شروع ہوتی ہے؟ ہندو مسلم اتحاد پر تقریر، چند نصیحتیں ضرور کرنی ہیں لیکن وہ تو آخر میں ہیں۔ وہ بیچ میں مسکرانا کہاں تھا؟

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے دل ہلا دیں گے اور آپ کو خون کے آنسو رلائیں گے..........''

صدر جلسہ کی آواز نعروں میں ڈوب گئی۔ دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہو رہی تھی۔ اتنے میں صدر نے مجھ سے کہا.......... مجھے الفاظ بالکل سنائی نہ دیئے۔ اتنا محسوس ہوا کہ تقریر کا وقت سر پر آن پہنچا ہے اور مجھے اپنی نشست پر سے اٹھنا ہے۔ چنانچہ ایک نامعلوم طاقت کے زیر اثر اٹھا ''کچھ لڑکھڑایا''۔ لیکن پھر سنبھل گیا۔ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ہال میں ایک شور تھا۔ میں بے ہوشی سے ذرا ہی ورے تھا اور نعروں

کی گونج ان لہروں کے شور کی طرح سنائی دے رہی تھیں جو ڈوبتے ہوئے انسان کے سر پر سے گزر رہی ہوں۔ تقریر شروع کہاں سے ہوتی ہے؟ لیڈروں کی خود غرضی بھی ضرور بیان کرنی ہے اور کیا کہنا ہے؟ ایک کہانی بھی تھی۔ بگلے اور لومڑی کی کہانی۔ نہیں ٹھیک ہے دو بیل..........''۔

اتنے میں ہال میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور سہارے کے لیے میز کو پکڑ لیا۔ میرا دوسرا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔ وہ بھی میں نے میز پر رکھ دیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میز بھاگنے کو ہے اور میں اسے روکے کھڑا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی کوشش کی۔ گلا خشک تھا۔ بصد مشکل میں نے یہ کہا:

''پیارے ہم وطنو!''

آواز خلافِ توقع بہت ہی باریک اور منحنی سی نکلی۔ ایک دو شخص ہنس دیئے۔ میں نے گلے کو صاف کیا تو اور کچھ لوگ ہنس پڑے۔ میں نے جی کڑا کر کے زور سے بولنا شروع کیا۔ پھیپھڑوں پر یک لخت جو یوں زور ڈالا تو آواز بہت ہی بلند نکل آئی۔ اس پر بہت سے لوگ کھِل کھِلا کر ہنس پڑے۔ ہنسی تھمی تو میں نے کہا:

''پیارے ہم وطنو!'

اس کے بعد ذرا دم لیا اور پھر کہا:

''پیارے ہم وطنو!''

کچھ یاد نہ آیا کہ اس کے بعد کیا کہنا ہے۔ بیسیوں باتیں دماغ میں چکر لگا رہی تھیں لیکن زبان تک ایک نہ آتی تھی۔

''پیارے ہم وطنو!''

اب کے لوگوں کی ہنسی سے میں بھنا گیا۔ اپنی توہین پر بڑا غصہ آیا۔ ارادہ کیا کہ اس دفعہ جو منہ میں آیا کہہ دوں گا۔ ایک دفعہ تقریر شروع کردوں تو پھر کوئی مشکل نہ رہے گی۔

"پیارے ہم وطنو! بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آب وہوا خراب یعنی ایسی ہے کہ ہندوستان میں بہت سے نقص ہیں۔۔۔ سمجھے آپ؟ (وقفہ۔۔۔) نقص ہیں لیکن یہ بات یعنی امر جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ گویا چنداں صحیح نہیں"۔ (قہقہہ)۔

حواس معطل ہو رہے تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر تقریر کا سلسلہ کیا تھا۔ یکلخت بیلوں کی کہانی یاد آئی اور راستہ کچھ صاف ہوتا دکھائی دیا۔

"ہاں تو بات دراصل یہ ہے کہ ایک جگہ دو بیل اکٹھے رہتے تھے جو باوجود آب وہوا اور غیر ملکی حکومت کے" (زور کا قہقہہ)

یہاں تک پہنچ کر محسوس کیا کہ کلام کچھ بے ربط سا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا، چلو وہ لکڑی کے گٹھے کی کہانی شروع کر دیں۔

"مثلاً آپ لکڑیوں کے ایک گٹھے کو لیجیے۔ لکڑیاں اکثر مہنگی ملتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں افلاس بہت ہے۔ گویا چونکہ اکثر غریب ہیں۔ اس لیے گویا لکڑیوں کا گٹھا یعنی آپ دیکھیے نا کہ اگر"۔

(بلند اور طویل قہقہہ)

"حضرات! اگر آپ نے عقل سے کام نہ لیا تو آپ کی قوم فنا ہو جائے گی۔ نحوست منڈلا رہی ہے۔" (قہقہے اور شور وغوغا۔۔۔ اسے باہر نکالو ہم نہیں سنتے)

ے شیخ سعدی نے کہا ہے کہ
چو از قومے یکے بے دانشی کرد

(آواز آئی: کیا بکتا ہے) خیر اس بات کو جانے دیجیے۔ بہر حال اس بات میں تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ:

ے آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

NOT FOR SALE

اس شعر نے دوران خون کو تیز کر دیا۔ ساتھ ہی لوگوں کا شور بھی زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ میں بڑے جوش سے بولنے لگا:

"جو قومیں اس وقت بیداری کے آسمان پر چڑھی ہوئی ہیں، اُن کی زندگیاں لوگوں کے لیے شاہراہ ہیں اور ان کی حکومتیں چار دانگِ عالم کی بنیادیں ہلا رہی ہیں۔ (لوگوں کا شور اور ہنسی اور بھی بڑھتی گئی) آپ کے لیڈروں کے کانوں پر خود غرضی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ زندگی کے وہ تمام شعبے۔۔۔۔"

لیکن لوگوں کا غوغا اور قہقہے اتنے بلند ہو گئے کہ میں اپنی آواز بھی نہ سن سکتا تھا۔ اکثر لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے تھے ___ میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ ہجوم میں سے کسی شخص نے بارش کے پہلے قطرے کی طرح ہمت کر کے سگریٹ کی ایک خالی ڈبیا مجھ پر پھینک دی۔ اس کے بعد چار پانچ کاغذ کی گولیاں میرے اردگرد سٹیج پر آگریں لیکن میں نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔

"حضرات! تم یاد رکھو تم تباہ ہو جاؤ گے"

"تم دو بیل ہو۔۔۔۔۔۔"

لیکن جب بوچھاڑ بڑھتی ہی گئی۔ تو میں نے اس نامعقول مجمع سے کنارہ کشی ہی مناسب سمجھی۔ اسٹیج سے پھلانگا اور زقند بھر کے دروازے میں سے باہر کا رخ کیا۔ ہجوم بھی میرے پیچھے لپکا۔ میں نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا بلکہ سیدھا بھاگتا گیا۔ وقتاً فوقتاً بعض نامناسب کلمے میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ اُن کو سن کر میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی اور سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا۔ ایک ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں بے تحاشا اس میں گھس گیا۔ ایک لمحے کے بعد وہ ٹرین وہاں سے چل دی۔

اُس دن کے بعد آج تک نہ مرید پور نے مجھے مدعو کیا ہے نہ مجھے خود وہاں جانے کی کبھی خواہش پیدا ہوئی ہے۔

(پطرس کے مضامین)

NOT FOR SALE

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

(الف) لیڈر کے اپنے گاؤں (مرید پور) نہ جانے پر لوگ کیا تبصرے کرتے تھے؟

(ب) بھتیجے نے اپنے چچا کو کس طرح مرید پور کا ''قومی لیڈر'' قرار دلوایا؟

(ج) لیڈر نے اپنی تقریر کے لیے کون سے نکات اکٹھے کیے؟

(د) مرید پور میں لیڈر کا استقبال کس طرح ہُوا؟

(ہ) جلسے کے دوران لیڈر کے بدحواس ہونے کی کیا وجہ تھی؟

(و) تقریر کے دوران لیڈر کا کیا حشر ہوا؟

۲۔ خالی جگہ مناسب الفاظ سے پُر کریں۔

(الف) خُدا آپ سب پڑھنے والوں کو انصاف کی ______ دے۔

(ب) خط پڑھ کر میری ______ کی انتہا نہ رہی۔

(ج) لیڈری کا ______ ایک لمحے میں ہی چڑھ جاتا ہے۔

(د) گھٹا سر پہ ______ کی چھا رہی ہے۔

(ہ) دنیا میری آنکھوں کے سامنے ______ ہو رہی تھی۔

۳۔ اس مضمون کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۴۔ اس مضمون سے کم از کم پانچ وصلی جملے تلاش کر کے لکھیں۔

۵۔ اس مضمون سے کم از کم پانچ ایسے جملے تلاش کر کے لکھیں جن میں امدادی افعال ہوں۔

۶۔ درج ذیل الفاظ پر اُن کے معنی کے مطابق اعراب لگائیں۔

جل (پانی)	جل (دھوکا)	دور (زمانہ)	دور (فاصلہ)
قسم (عہد، ارادہ)	قسم (طرح، طرز)	گل (مٹی)	گل (پھول)
منت (التجا)	منت (نیت، عہد)	نفس (سانس)	نفس (روح، وجود)
ملکہ (صلاحیت)	ملکہ (بادشاہ کی بیوی)		

۷۔ کسی تقریب یا جلسے کی روداد لکھیں۔

۸۔ اس مضمون سے کم از کم پانچ ایسے جملے لکھیں جن میں ''کہ'' کا استعمال ہو۔

۹۔ ذیل میں متن کے مفہوم کے مطابق مختلف جملے لکھے گئے ہیں۔ آپ ان کے سامنے ''درست'' یا ''غلط'' لکھیں۔

ا۔ میں اپنے وطن میں نہ جانے کی وجہ سے مشکوک ہو گیا تھا۔

ب۔ میں کانگرس کے جلسوں میں ذوق وشوق سے شریک ہوتا تھا۔

ج۔ میرے بھتیجے نے تمام خطوط نشر کر دیے۔

د۔ مصنف مرید پور کا رہنے والا تھا۔

ہ۔ مرید پور کے لوگ مصنف سے حسد کرنے لگے تھے۔

و۔ متحد قومیں ہی بامِ عروج حاصل کرتی ہیں۔

ز۔ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔

ح۔ صدرِ جلسہ نے پرتپاک استقبال کیا۔

ط۔ مصنف نے انتہائی مؤثر تقریر کی۔

ی۔ مصنف نے تقریر ختم کی تو لوگوں نے تعریف شروع کر دی۔

مشتاق احمد یوسفی

ولادت: ۱۹۲۳ء وفات: ۲۰۱۸ء

مشتاق احمد یوسفی راجستھان کی ایک مسلم ریاست ٹونک کے ایک تعلیم یافتہ مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یوسفی صاحب نے ابتدائی تعلیم، عربی، فارسی اور دینیات، گھر پر ہی حاصل کی۔ انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے بی۔اے کیا اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی سے فلسفے میں ایم۔ اے کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ پاکستان آئے اور کراچی میں رہائش پذیر ہوئے۔ انھوں نے عملی زندگی کا آغاز بینکنگ سے کیا اور ساری زندگی مختلف بینکوں سے منسلک رہے اور بطور چیئرمین پاکستان بینکنگ کونسل ریٹائر ہوئے۔ آج کل کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔

اُردو مزاح میں یوسفی صاحب کا ایک بلند مقام ہے۔ وہ ایک فطری مزاح نگار ہیں۔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل ہونے کی وجہ سے ان کے مزاج میں ایک خاص سلیقہ اور رکھ رکھاؤ ہے۔ ہم بلا تکلّف کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مزاح کی بنیاد ایک اعلیٰ تہذیبی شعور اور مذاقِ سلیم پر استوار ہے۔ یوسفی صاحب کی تحریروں سے ان کے گہرے سماجی شعور کا پتا چلتا ہے۔ ان کی تحریریں نہ صرف مسکرانے پر مجبور کرتی ہیں، بلکہ سوچ و فکر کے لیے مواد بھی مہیا کرتی ہیں۔

یوسفی صاحب اپنے مضامین کے لیے عام زندگی کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ ایسے مضامین کا انتخاب کرتے ہیں، جنھیں عام طور پر افتادہ اور ناقابل توجہ سمجھا جاتا ہے، لیکن یوسفی صاحب اپنی نکتہ آفرینی کے ذریعے اسے شاہکار بنا دیتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ اور صاف ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں وہ بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ دراصل یہ الفاظ کا انتخاب ہی ہے، جو مسلسل قارئین کے لبوں پر ہنسی بکھیرتا رہتا ہے۔

تصانیف: خاکم بدہن، چراغ تلے، زرگزشت، آبِ گم۔

حاجی اورنگ زیب خان

(آڑھتیانِ سوداگران چوب ہائے عمارتی)

ابھی مولانا کرامت حسین کے وظیفے کو چالیس دن نہیں ہوئے تھے کہ بشارت ایک اور قضیے میں اُلجھ گئے، جو کچھ اس طرح تھا کہ حاجی اورنگ زیب خان، آڑھتیان و سوداگرانِ چوب ہائے عمارتی، پشاور ان سے رقم وصول کرنے آدھمکے۔ اُنھوں نے کوئی ایک سال قبل اعلیٰ درجے کی لکڑی پنجاب کے ایک آڑھتی کی معرفت بشارت کو سپلائی کی تھی۔ یہ داغدار نکلی۔ جب یہ سال بھر تک نہیں بکی تو بشارت نے گھاٹے سے سات ہزار میں فروخت کردی۔ بشارت کا موقف تھا کہ میں نے یہ لکڑی سات ہزار میں گھاٹے سے بیچی ہے۔ خان صاحب فرماتے تھے کہ آپ کی آدھی لکڑی تو چور لے گئے۔ آدھی پولیس والوں نے ہتھیالی۔ آپ اسے بیچنا کہتے ہیں اس کے لیے تو پشتو میں بہت بُرا لفظ ہے۔

بشارت کے تخمینے کے مطابق لکڑی کی مالیت کسی طرح سات ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ اِدھر حاجی اورنگ زیب خاں اُصولی طور پر ایک پائی بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے، جس کا مطلب یہ تھا کہ بشارت بقیہ رقم یعنی ۲۵۷۳-۹-۳[۱] روپے اپنی گرہ سے بھریں۔ (یہ رقم آج کے پندرہ ہزار روپے کے برابر تھی[۲]) خان صاحب کہتے تھے کہ آپ نے مال بیچنے میں شیطانی عجلت سے کام لیا۔ جلدی کام شیطان کا۔ ''صیب! یہ لکڑی تھی، بالغ لڑکی تو نہیں جس کی جلد از جلد رخصتی کرنا کارِ ثواب ہو۔''

ایک مدّت سے اس رقم کے بارے میں خط و کتابت ہو رہی تھی۔ ایک دن صاحب کے دل میں نہ

---

(۱) دو ہزار پانچ سو تہتر روپے نو آنے اور تین پیسے۔

(۲) یہ مضمون آج سے تقریباً پچیس سال پہلے لکھا گیا تھا۔

جانے کیا آئی کہ قانونی نوٹس کی رجسٹری کرائی اور پشاور جنرل پوسٹ آفس سے سیدھے گھر آئے۔ سامان باندھا اور نوٹس سے پہلے خود کراچی پہنچ گئے۔ نوٹس ان کی آمد کے تین دن بعد ان کی موجودگی میں اس طرح موصول ہوا کہ رجسٹری خود انھوں نے ڈاکیے کے ہاتھ سے چھین کر کھولی۔ نوٹس نکال کر پھاڑ دیا اور لفافہ بشارت کو تھما دیا۔ قیام بھی انھی کے ہاں کیا۔ اس زمانے میں دستور تھا کہ آڑھتی یا تھوک بیوپاری آئے تو اسے گھر پر ہی ٹھہرایا جاتا تھا۔ یوں بھی بشارت کی خان صاحب سے خوب بنتی تھی۔ بشارت، خان صاحب کے خلوص و مدارات کے گرویدہ اور خان صاحب ان کی لچھے دار باتوں کے دلدادہ۔

دن بھر ایک دوسرے کے ساتھ جھائیں جھائیں کرنے کے بعد، شام کو خان صاحب، بشارت کے ساتھ ان کے گھر چلے جاتے، جہاں ان کی اس طرح خاطر مدارات ہوتی جیسے دن میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ گھر والے ان کی خاطر داریاں کرتے کرتے تنگ آ چکے تھے۔ اس کے باوجود خان صاحب شاکی تھے کہ کراچی میں پتلے شوربے کا سالن کھا کھا کے میری نظر کمزور ہو گئی ہے۔ قدرے لنگڑا کر چلنے لگے تھے۔ فرماتے تھے، گھٹنوں میں شوربہ اُتر آیا ہے رات کے کھانے کے بعد سوجی کا حلوہ ضرور طلب کرتے۔ فرماتے تھے، حلوہ نہ کھاؤں تو بزرگوں کی روحیں خواب میں آ آ کر ڈانٹتی ہیں۔ اکثر اُن سالم رانوں کو یاد کر کے آہیں بھرتے جو ان کے دسترخوان کی زینت ہوا کرتی تھیں۔ اُن کا پیٹ اعلیٰ نسل کے بَرّوں (دنبوں) کا قبرستان تھا، جس کے وہ مجاور تھے۔ بشارت نے دوپہر کو ان کے لیے فرنٹیر ہوٹل سے ران اور چپلی کباب منگانے شروع کیے۔ مرزا نے کئی مرتبہ کہا کہ اس سے تو بہتر ہے کہ ۳-۹-۲۵۷۳ روپے دے کر اپنا پنڈ چھڑاؤ۔ یہ پھر بھی سستا پڑے گا مگر بشارت کہتے تھے کہ سوال روپے کا نہیں، اصول کا ہے۔ خان صاحب بھی اسے اپنی انا اور اصول کا مسئلہ بنائے ہوئے تھے۔

اولیاء اللہ جس یکسوئی اور استغراق سے مراقبہ اور خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ خان صاحب اس سے زیادہ یکسوئی اور استغراق، غذا پر صَرف کرتے تھے۔ دس سیر سُوجی بطورِ سوغات کراچی لائے تھے۔ اسی کا حلوہ بنوا بنوا کر کھا رہے تھے۔ بشارت روز سوجی کی بوری دیکھتے اور دہل جاتے اس لیے کہ ابھی تو اس کے ختم

ہونے میں بہت دیر تھی۔ خان صاحب فرماتے تھے کہ اگلی دفعہ مردان شوگر ملز سے تازہ گڑ کی بوری لاؤں گا۔ سفید چینی کھانے سے خون پتلا پڑ جاتا ہے۔

خان صاحب کے اپنے دسترخوان اور خاطر مدارات کا کیا کہنا۔ بشارت کو پشاور میں ان کے ہاں مہمان رہنے کا اتفاق ہوا۔ ہر کھانے پر بکری یا دنبے کی مُسَلَّم ران سامنے رکھ دیتے۔ ناشتے اور چائے پر البتہ مرغی کی ٹانگ پر اکتفا کرتے۔ ان کے دسترخوان پر ران اور ٹانگ کے سوا کسی اور حصے کا گوشت نہیں دیکھا۔ نہ کبھی سبزی یا مچھلی دیکھی، جس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی تھی کہ بینگن اور مچھلی کی ٹانگیں نہیں ہوتیں۔

خان صاحب وجیہہ اور بھاری بھرکم آدمی تھے۔ ان کی لغو بات میں بھی وزن محسوس ہوتا تھا۔ قد تقریباً ساڑھے چھ فٹ، جسے کلاہ اور طرے سے ساڑھے سات فٹ بنا رکھا تھا، مگر آٹھ فٹ کے لگتے تھے۔ صحت اور کاٹھی اتنی اچھی کہ عمر کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ تن و توش کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہتھے والی کرسی پر جیسے تیسے ٹُھنس کر بیٹھ تو جاتے، لیکن جب اٹھتے تو کرسی بھی ساتھ اُٹھتی، سنہری مونچھیں اور ہلکی براؤن آنکھیں۔ بائیں رخسار پر زخم کا ہلالی نشان، جو اگر نہ ہوتا تو چہرہ ادھورا دکھائی دیتا انگشتِ شہادت دوسری پور سے کٹی ہوئی۔

ان کی کٹی انگلی بھی ہماری ثابت انگلی سے بڑی تھی۔ پاس اور دور کی نظر خاصی کمزور تھی، لیکن عینک لگانے سے حتی الامکان احتراز کرتے۔ صرف چیک پر دستخط کرنے کے لیے پاس کی عینک لگا لیتے اور اتارنے سے پہلے جلدی جلدی اسی سے دور کی چیزیں دیکھنے کی کوشش کرتے۔ یہ معلومات ان کی دن بھر کی جغرافیائی ضروریات کے لیے کافی ہوتی تھیں۔ آنکھوں میں شوخی کی ہلکی سی تحریر۔ کُھل کر ہنستے، تو چہرہ انار دانہ ہو جاتا۔ چہرے پر ہنسی ختم ہونے کے بعد اس کی اندرونی لہروں سے پیٹ دیر تک ہچکولے کھاتا رہتا۔

واسکٹ کی جیب میں جو طلائی گھڑی رکھتے تھے، اس کی زنجیر دو فٹ لمبی ضرور ہوگی۔ اس لیے کہ واسکٹ کی ایک جیب سے دوسری جیب کا فاصلہ اتنا ہی تھا۔ جتنی دیر میں خان صاحب کی شلوار میں کمر بند ڈلتا، اتنی دیر میں آدمی حیدر آباد ہو کر آ سکتا تھا۔ پُرخور تھے۔ دورانِ طعام، کلام سے پرہیز کرتے اور پانی نہیں پیتے

تھے کہ خواہ مخواہ جگہ گھیرتا ہے۔ دال کو ہندوانہ بدعت اور سبزی کھانے کو مویشیوں کی صریح حق تلفی سمجھتے تھے۔ کڑاہی گوشت کا مطلب صرف یہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کڑاہی گوشت کھائیں گے، بلکہ کڑاہی بھر کے کھائیں گے۔ خیریت گزری کہ اس زمانے میں بالٹی گوشت کا رواج نہیں تھا، ورنہ وہ یقیناً بالٹی کو کڑاہی پر ترجیح دیتے۔ تیتر بٹیر کی ہڈیوں، انگور، مالٹے اور تربوز کے بیج تھوکنے کو زنانی نزاکتوں میں شمار کرتے تھے۔ اپنے تن و توش اور ہیئت کذائی (جسے ہیئتِ غذائی کہنا بہتر ہوگا) سے خود عاجز تھے۔ گھومنے پھرنے اور چہل قدمی کے شوقین، مگر اس شرط پر کہ ہر چالیس قدم کے بعد ستانے اور کچھ پیٹ میں ڈالنے کے لیے توقف فرمائیں گے تاکہ تازہ دم ہو کر آگے بڑھیں۔ یعنی اگلے چالیس قدم۔ مانا کہ خان صاحب میں اتنی پھرتی اور چلت پھرت نہ تھی کہ بڑھ کر دشمن پر حملہ کرسکیں، لیکن ہنگامِ قتال اگر وہ اس پر صرف گر پڑتے تو وہ پانی نہ مانگتا۔ ہاتھ پاؤں مارے بغیر وہیں دَم گھٹ کے ڈھیر ہو جاتا۔

ان کی ہنسی کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بڑے زور سے ایک لمبا قہقہہ لگانا چاہتے ہیں مگر بوجوہ اسے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے منھ سے بڑی دیر تک ایسی آوازیں نکلتی رہتیں جیسے بیٹری خلاص ہونے کے بعد کار کو بار بار اسٹارٹ کرنے سے نکلتی ہیں۔ ہنسنے سے پہلے بالعموم اپنی واسکٹ کے بٹن کھول دیتے تھے، کہتے تھے پردیس میں روز روز کس سے بٹن ٹکواؤں۔

آپ چاہیں تو خان صاحب کو ان پڑھ کہہ سکتے ہیں، مگر ان گھڑ یا جاہل ہرگز نہیں۔ رچی بسی طبیعت، بلا کی سوجھ بوجھ اور نظر رکھتے تھے، جو فوراً بات کی تہ تک پہنچ جاتی تھی۔ صحیح معنوں میں شائستۂ حیات تھے کہ انھوں نے انسان اور زندگی کو ہر رنگ میں سہا اور برتا تھا۔

خان صاحب مدرسۂ حیات کے منتہیوں اور فارغین میں سے تھے۔ خان صاحب برسوں تک، چیک پر انگوٹھا لگاتے رہے، لیکن جس دن ان کا بینک بیلنس ایک لاکھ ہوگیا، انھوں نے اردو میں دستخط کرنے سیکھ لیے۔ فرماتے تھے، انگوٹھا لگا کے سود خور بینکوں سے اوور ڈرافٹ لینے میں تو کوئی ہرج نہیں، پر حلال کی

کمائی کی رقم سوچ سمجھ کر نکالنی چاہیے۔ دستخط کیا تھے، لگتا تھا کوئی لنگڑا کاکروچ دوات میں غسل کر کے کاغذ پر سے گزر گیا ہے۔ دستخط کے دوران ان کا ہاتھ ایسے توڑا مروڑی سے گزرتا اور ہر چھوٹا بڑا دائرہ بناتے وقت ان کے کھلے ہوئے منہ کی گولائی اس طرح گھٹتی بڑھتی کہ دیکھنے والے کی آنکھ میں باؤٹا آجاتا۔ اس زمانے میں خان صاحب کا اکاؤنٹ مسلم کمرشل بینک، چوک یادگار برانچ میں تھا، جہاں اردو میں دستخط کرنے والوں کو اسٹامپ کاغذ پر یہ توہین آمیز indemnity (ضمانت) دینی پڑتی تھی کہ اگر ان کے اکاؤنٹ میں جعلی دستخطوں کے سبب کوئی فراڈ ہوجائے تو بینک ذمہ دار نہ ہوگا۔ بلکہ اگر اس کے نتیجے میں بینک کو کوئی نقصان بالواسطہ یا بلاواسطہ پہنچے تو اسے بھی وہی بھریں گے۔ خان صاحب کو جب اس کا مطلب پشتو میں سمجھایا گیا تو مشتعل ہوگئے۔ اُردو بولنے والے اکاؤنٹنٹ سے کہنے لگے کہ ایسی بیہودہ شرط ماننے والے کے لیے پشتو میں بہت برا لفظ ہے۔ ہمارا دل بہت خفا ہے۔ بکتے جھکتے بینک کے انگریز منیجر کے پاس احتجاج کرنے گئے۔ کہنے لگے کہ میرے دستخط اتنے خراب ہیں کہ کوئی تعلیم یافتہ آدمی بنا ہی نہیں سکتا۔ جب میں خود اپنے دستخط اتنی مصیبت سے کرتا ہوں تو دوسرا کیسے بنا سکتا ہے؟ آپ کے اسٹاف میں دو درجن آدمی تو ہوں گے۔ سب کے سب شکل سے چور، اُچکے اور نوسرباز لگتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی میرے دستخط بنا کر دکھا دے، تو فوراً ایک ہزار انعام دوں گا پھر گولی سے اُڑا دوں گا مسٹر میکلین نے کہا کہ میں بینک کے قوانین نہیں بدل سکتا۔ گرنڈ لیز بینک میں بھی یہی قاعدہ ہے۔ ہم نے سارے فارم اسی سے نقل کیے ہیں۔ نقل کیا، مکھی پہ مکھی ماری ہے۔ بلکہ اس فارم پر تو پرنٹر کی لاپروائی سے نام بھی گرنڈ لیز بینک ہی کا چھپا ہے۔ خان! انگریزی میں دستخط کرنے سیکھ لو تو اس جھمیلے سے خود بخود نجات مل جائے گی۔ اپنے حکم میں التجا کا رنگ پیدا کرنے کی غرض سے اس نے خان صاحب کی چائے اور پیسٹری سے تواضع کی۔ بامتثالِ امر، خان صاحب دو مہینے تک انگریزی دستخطوں کی مشق کرتے رہے۔ جب بالکل رواں اور پختہ ہو گئے، تو چق اُٹھا کر سیدھے مسٹر میکلین کے کمرے میں داخل ہوئے اور روبرو دستخط کر کے دکھائے۔ وہ اس طرح کہ پہلے ہاتھ اونچا کر کے چار پانچ دفعہ ہوا میں دستخط کیے اور پھر یکلخت قلم کاغذ پر رکھ کر فراٹے سے دستخط کر دیے۔ اس نے تُرنت ایک سلپ پر

اکاؤنٹنٹ کو حکم دیا کہ ان کی اڈمنٹی منسوخ تصور کی جائے۔ میں ان کے انگریزی دستخط کی، جو انھوں نے میری موجودگی میں اس کارڈ پر کیے ہیں، تصدیق کرتا ہوں۔

ہوا صرف اتنا تھا کہ خان صاحب نے ان دو مہینوں میں اپنے اردو دستخط کو دائیں سے بائیں کرنے کی بجائے بائیں سے دائیں کرنے کی مشق و مہارت بہم پہنچائی، جس کے دوران نقطے اور مرکز غائب ہوگئے۔ مسٹر میکلین کے سامنے انھوں نے یہی دستخط بائیں سے دائیں کیے اور تمام عمر اسی انگلش روش پر قائم رہے۔ چیک اور کاروباری کاغذات پر اسی طرح دستخط کرتے، لیکن اگر کسی دوست یا رشتہ دار کو خط لکھواتے یا کوئی حلف نامہ داخل کرتے، جس میں سچ بولنا ضروری ہو، تو آخر میں اردو میں دستخط کرتے۔ مطلب یہ کہ قلم دائیں سے بائیں چلتا۔ خان صاحب کو دستخط کرنے کے فن پر اب اتنی قدرت حاصل ہوگئی تھی کہ اگر جاپانی میں دستخط کرنے کے لیے کہا جاتا تو وہ اسی لیٹے ہوئے کاکروچ کو مونچھیں پکڑ کے سر کے بل کھڑا کردیتے۔

خان صاحب کو کبھی بہ عجلت اتمامِ حجت کرنا مقصود ہوتا، یا مخالف و مخاطب کو محض بوجھوں مارنا ہوتا، تو فرماتے کہ شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ .... وہ اپنے تمام زرّیں و غیر زرّیں اقوال سے شیخ سعدی کے حق میں دست بردار ہوگئے تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ شیخ سعدی اگر ان کے اقوال کو سن لیتے تو وہ خود بھی دست بردار ہوجاتے۔

بات کتنی ہی غیر متعلق اور چھوٹی سی ہو، خان صاحب اس کی پچ میں بڑے سے بڑا نقصان اُٹھانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ درگزر اور سمجھوتے کو انھوں نے ہمیشہ شیوۂ مردانگی کے خلاف جانا۔ اکثر فرماتے کہ جو شخص خون خرابہ ہونے سے پہلے ہی سمجھوتا کرلے، اس کے لیے پشتو میں بہت بُرا لفظ ہے۔ بشارت کو ایک مرتبہ بنوں میں ان کے آبائی مکان میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ دیکھا کہ خان صاحب کسی گھمسان کے بحث مباحثے میں جیت جاتے یا کسی خوشگوار واقعے پر بہت خوش ہوتے تو فوراً باہر جا کر گھوڑے پر چڑھ جاتے اور اپنے کسی دشمن کے گھر کا چکر لگا کر واپس آجاتے۔ پھر ملازم سے اپنے سر پر ایک آفتابہ ٹھنڈے پانی کا ڈلواتے کہ غرور اللہ کو پسند نہیں۔

خان صاحب دن میں دو تین مرتبہ بشارت کو یہ دھمکی ضرور دیتے کہ "ایک پائی بھی نہیں چھوڑوں گا۔ خواہ مجھے ایک سال تمھارے ہاں مہمان رہنا پڑے"۔ وقتاً فوقتاً یہ بھی کان میں ڈالتے رہتے کہ قبائلی آداب میزبانی کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اگر آپ عزیز مہمان سے یہ پوچھ بیٹھیں کہ تم کب جاؤ گے اور اس پر وہ آپ کا خون نہ کردے، تو اس کی شرافت اور پختو میں شبہ ہوگا۔

صبح سے شام تک دونوں بارہ سنگھے اپنے سینگ پھنسائے پھنکاریں مارتے رہتے۔ خوش معاملگی کا واسطہ، بیوپار بیوہار کی رِیت رسم، رحم کی اپیل اور ایک دوسرے کو ظلم اور دھاندلی سے باز رہنے کی وارننگ کے علاوہ کوئی اوچھا ہتھیار نہ تھا، جو اس جھگڑے میں بے دریغ استعمال نہ کیا گیا ہو۔ مثلاً خان صاحب اپنے بے پڑھے لکھے ہونے کا واسطہ دیتے۔ جواب میں بشارت خود کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دکھواتے کہ شاعر ہوں۔ بی اے ہوں۔ فارسی پڑھی ہے اور لکڑی بیچ رہا ہوں! خان صاحب اپنی بزنس میں گھاٹے کا ذکر کرتے تو بشارت کہتے، ارے صاحب یہاں تو سرے سے بزنس ہی نہیں۔ گرہ کا کھا رہے ہیں۔ بشارت تو خیر بیوہ میم کے ساتھ اپنی فرضی مسکینی، کثیر الاولادی اور مفلوک الحالی کا ریہرسل کر چکے تھے، لیکن خان صاحب بھی بوقتِ ضرورت اپنے حال پر مگر مچھ کے آنسو بہا سکتے تھے۔ ایک دن تو ان کی ایکٹنگ اتنی مکمل تھی کہ سیدھی آنکھ سے ایک سچ مچ کا آنسو سری لنکا کے نقشے کی طرح لٹک رہا تھا۔ سائز بھی وہی۔ ایک دفعہ خان صاحب نے اپنی فرضی مظلومیت کا ترپ پھینکا کہ میرے حصے کی زمینوں پر چچا نے نصف صدی سے قبضہ کر رکھا ہے۔ بشارت نے اس کو اس طرح کاٹا کہ اپنے پیٹ کے السر پر ہاتھ رکھ کر حلفیہ کہا کہ وہ اتنی ہی مدت سے ضعفِ معدہ میں مبتلا ہیں۔ ویسے ان چونچوں میں بالعموم بشارت ہی کا پلہ بھاری رہتا، لیکن ایک دن جب خان صاحب نے نیم آبدیدہ ہو کر کہا کہ میرے تو والد بھی فوت ہوچکے ہیں، تو بشارت کو اپنے بزرگوار پر بہت غصہ آیا کہ انھیں بھی اسی وقت جینا تھا۔

لفظوں کی جنگ میں فتح کسی بھی فریق کی ہو، شہید صرف سچائی ہوتی ہے۔

خان صاحب کسی طرح رقم چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ بشارت نے عاجز آ کر یہاں تک کہا کہ کون صحیح ہے، کون غلط، اس کو بھول جائیے۔ یہ دیکھیے کہ آپ کا ہمارا بیوپار آئندہ بھی رہے گا۔ پھر کبھی کسر نکال لیجیے گا۔ خدانخواستہ یہ آخری سودا تو ہے نہیں۔ اس پر خان صاحب بولے: کہ خان سنگ مرجان خان نے مجھے نصیحت کی تھی کہ دوست سے ملو، تو اس طرح ملو جیسے آخری ملاقات ہے۔ اب کے بچھڑے پھر نہیں ملیں گے اور کسی سے سودا کرو، تو یہ سمجھ کے کرو کہ آخری سودا ہے۔ شیخ سعدی کہتے ہیں کہ باؤلے سے باؤلا کتا بھی یہ امید نہیں رکھ سکتا کہ جسے اس نے کاٹا ہے، وہ خود کو پھر کٹوانے کے لیے دوبارہ سہ بارہ آئے گا۔

خان صاحب اتوار کو سارے دن پلنگ پر نیم دراز ہو کر قبائلی تنازعوں اور کوہاٹ کی زمینوں کے فیصلے کرتے۔ اب وہ اورنگ زیب خاں کے بجائے پلنگ زیب خاں زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ رات کو البتہ فرش پر سوتے۔ فرماتے تھے کہ اس سے تکبر اور کمر کا درد دور ہوتا ہے۔ ہمارے فرنٹیر میں جاڑے میں شوقین لوگ پیال (باریک خشک گھاس) پر سوتے ہیں۔ پیال سے رات بھر جنگلوں اور پہاڑوں کی خوشبو آتی رہتی ہے۔ جس آدمی کو جنگل کی خوشبو آتی اور بھاتی رہے، وہ کبھی کسی کی غلامی اور محکومی قبول نہیں کرے گا۔

نماز کے بعد کرتا اتار کر اجلاس فرماتے۔ بیشتر بنیانوں میں بڑے بڑے چھید ہو گئے تھے۔ فرماتے تھے، کیا کروں، میرے سائز کا بنیان صرف روس سے اسمگل ہو کے آتا ہے۔ کبھی کبھار لنڈی کوتل میں مل جاتا ہے، تو عیش آجاتے ہیں۔ کوئی کوئی بنیان تو اتنا خوب صورت ہوتا کہ کُرتے کے اوپر پہننے کو جی چاہتا ہے۔ خان صاحب گہرا سانس لیتے یا ہنسی کا دورہ پڑتا، تو چَوَنّی برابر سوراخ پھیل کر پنگ پانگ کی گیند کے برابر ہو جاتے۔

دوسرے مشاعرے کے بعد خان صاحب نے بڑی حیرت سے پوچھا، کیا یہاں ہر دفعہ یہی ہوتا ہے؟ جواب ملا، اور کیا! بولے: خدا کی قسم! اس چاندنی پر اتنا جھوٹ بولا گیا ہے کہ اس پر نماز جائز نہیں! ایسے جھوٹے شاعروں کی میّت کو تو حقے کے پانی سے غسل دینا چاہیے"۔

خان صاحب کے لیے شاعروں کا اتنا بڑا اجتماع ایک عجوبے سے کم نہ تھا۔ کہنے لگے، اگر قبائلی علاقے میں کسی شخص کے گھر کے سامنے ایسے مجمع لگے، تو اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں، یا تو جرگہ بیٹھا ہے یا اس کا والد فوت ہو گیا ہے۔

کبھی کوئی شعر پسند آ جائے، گو کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا، تو "وئی!" کہہ کر فرطِ سرور سے آنکھیں بند کر لیتے اور جھومنے لگتے، شاعر وہ شعر مکرر پڑھنے لگتا، تو اسے ہاتھ کے درشت اشارے سے روک دیتے کہ اس سے ان کے لطف میں خلل واقع ہوتا ہے۔

ایک دن ایک نوجوان شاعر نے دوسرے سے باز پرس کی کہ تم نے میری زمین میں غزل کیوں کہی؟ اس نے کہا، سودا کی زمین ہے۔ تمھارے باپ کی نہیں! اس شاعر پہ یہ الزام بھی لگایا کہ وہ اضافت بہت کھاتا ہے۔ اس پر دونوں میں کافی تلخ کلامی ہوئی۔ شروع میں تو خان صاحب کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ جھگڑا کس بات کا ہے۔ اگر زرعی زمین کا تنازعہ ہے، تو زبانی کیوں لڑ رہے ہیں؟

انھیں خوشی کے عالم میں بارہا، گاتے گنگناتے بھی دیکھا۔ اپنے زمانے میں ٹنگ ٹکور کے رسیا رہ چکے تھے۔ انھیں بے شمار ٹپے یاد تھے، مگر ایک پشتو گیت ان کا فیورٹ تھا، جس کا روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں خون کرتے تھے۔ ان کا مکھڑا کچھ اس طرح تھا کہ دیکھ دلدارا! میں نے تیری محبت میں رقیب کو ننگی تلوار سے قتل کر ڈالا۔ کانوں پہ ہاتھ رکھ کر "یا قربان!" کے الاپ کے بعد، جس والہانہ انداز سے وہ گاتے تھے اس سے تو یہی ٹپکتا تھا کہ موصوف کو جو لذت قتل میں ملی، وصل میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہ ملا۔

خان صاحب اپنے اہالی موالی کی معیّت میں جب کچی آبادیوں اور پٹھان بستیوں کا دورہ کرتے اور راستے میں کوئی بھاری پتھر پڑا نظر آ جاتا، تو کھِل اٹھتے۔ وہیں رک جاتے۔ جوانوں کو اشارہ کرتے کہ اسے اٹھا کر دکھاؤ تو جانیں۔ اگر کسی سے نہ اٹھتا، تو آستین چڑھا کر آگے بڑھتے اور سر سے اونچا اُٹھا کر دکھاتے۔ راہ چلتے لوگ اور محلے کے بچے تماشا دیکھنے کھڑے ہو جاتے۔ کبھی کراچی کی خوش حال اور صاف ستھری

بستیوں سے سواری بادِ بہاری گزرتی، تو افسوس کرتے کہ خا! یہ کیسی جھاڑو پھری خانہ خراب بستی ہے کہ ایک پتھر پڑا نظر نہیں آتا جسے کوئی مرد بچہ اٹھا سکے۔

محبت اور نفرت دونوں کا اظہار خان صاحب "ویٹ لفٹنگ" سے کرتے۔ مطلب یہ کہ بحث میں ہار جائیں، تو حریف کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیتے اور اگر مدت کے بچھڑے دوست مل جائیں یا ہم جیسے ناقابلِ رشک قدو قامت والے نیاز مند سلام کریں، تو معانقے کے دوران ہمیں اس طرح ہلاتے جھنجھوڑتے جیسے پھل دار درخت کی شاخ کو جھڑ جھڑاتے ہیں۔ پھر فرطِ محبت سے ہمیں زمین سے ادھر اٹھا لیتے۔ ہماری پریشانی کو اپنی Lip Level تک لاتے اور چوم کر وہیں ہوا میں نیوٹن کے سیب کی مانند گرنے کے لیے چھوڑ دیتے۔

سچ بات کہنے میں خان صاحب اتنے ہی بے بس تھے جتنے ہم آپ چھینک کے معاملے میں۔ منہ پر آئی بات اور ڈکار کو بالکل نہیں روکتے تھے۔ اگر ان کی کسی بات سے دوسرا آزردہ یا مشتعل ہو جائے تو انھیں پوری طرح اطمینان ہو جاتا تھا کہ سچ بولا ہے۔ مثلاً ایک دفعہ ایک صاحب سے ان کا تعارف کرایا گیا۔ چھوٹتے ہی پوچھنے لگے "ایسی مونچھیں رکھ کر آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟" وہ صاحب بُرا مان گئے تو کہنے لگے: معاف کرنا! میں جاہل آدمی ہوں۔ یوں ہی اپنا علم بڑھانے کے لیے پوچھ لیا تھا۔

ایک طرف تو خان صاحب کی حساب فہمی کی یہ انتہا کہ ایک پائی چھوڑنے میں ان کی پختو پر حرف آتا تھا۔ دوسری طرف محبت و پاسداری کا یہ عالم کہ جہاں بشارت کا پسینا گرے وہاں ان کے دشمن کا خون بہانے کے لے تیار۔ بشارت کی دکان سے ایک ایکسائز انسپکٹر چار سال قبل دس ہزار روپے کی لکڑی ادھار لے گیا اور ہنوز رقم دبائے بیٹھا تھا۔ بشارت نے منجملہ اپنی اور پریشانیوں کے اس نقصان کا بھی ذکر کیا۔ دوسرے دن شام کو بعد مغرب، خان صاحب اپنے پچیس تیس کمانڈوز کی نفری لے کر اس کے گھر پہنچ گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ انسپکٹر نے کھولا اور سببِ نزول دریافت کیا، تو خان صاحب نے کہا کہ ہم وہ کھڑکی دروازے اکھاڑ کر لے جانے کے لیے آئے ہیں، جن میں ہمارے بھائی بشارت کی لکڑی استعمال ہوئی ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے ایک ہی جھٹکے سے دروازے قبضے، اسکرو اور ہینڈل سمیت اکھاڑ کر اس طرح بغل میں دبا لیا، جیسے

مکتب کے بھگوڑے لڑکے تختی بغل میں دبائے پھرتے ہیں۔ دیوار پر سے انسپکٹر کے دادا مرحوم کا فوٹو جس کے بارے میں انھیں شبہ گزرا کہ اس کے فریم میں وہی لکڑی استعمال ہوئی ہے، کیل سمیت نوچ کر اپنے ایک لیفٹیننٹ کو تھما دیا۔ انسپکٹر ایک گھاگ تھا۔ موقعے کی نزاکت سمجھ گیا۔ کہنے لگا، خان صاحب! بندہ ایک معروضہ گوش گزار کرنا چاہتا ہے۔ خان صاحب بولے، زہ مڑہ۔ اب وہ کسی خرگوش کے گوش گزار کرنا۔ بھرا ہوا پیٹ فارسیاں بولتا ہے۔ ہوش میں آؤ، رقم نکالو۔

رات کے بارہ بجنے میں ابھی چار پانچ منٹ باقی تھے کہ خان صاحب نے دس ہزار کے نئے نوٹوں کی دس گڈیاں لا کر بشارت کے حوالے کر دیں۔ یہی نہیں، انھوں نے اس سے اپنے پہلوان کمانڈوز کی رکشاؤں کا کرایہ اور دودھ کے پیسے بھی بحساب ایک سیر فی کس وصول کر لیے۔

خان صاحب گھر والوں میں ایسے گھُل مل گئے کہ اکثر شام کو بچوں کے لیے (جو انھیں چچا کہنے لگے تھے، مٹھائی، کپڑے اور کھلونے لے کر جاتے) سب سے چھوٹے بچے کو پیٹ پر اُچھالتے۔ پڑوس کے بچے انھیں دیکھتے ہی ان کے پیٹ کے لیے مچلنے لگتے اور ماؤں کے سر ہو جاتے۔

ایک دن صبح اٹھتے ہی خان صاحب نے اچانک یہ تجویز پیش کی کہ اب تک جو رقم آپ نے دی ہے اسے منہا کرنے کے بعد جو رقم واجب الادا بنتی ہے اس کے عوض یہ گاڑی جو عرصۂ دراز سے بیکار کھڑی ہے مجھے دیجیے۔ بشارت نے کہا، لکڑی کی اصل مالیت کسی طرح سات ہزار سے زائد نہیں، جبکہ اس گاڑی کی قیمت، مع نئی باڈی اور نئے پرزوں کے کسی طرح نو ہزار سے کم نہیں۔ خان صاحب نے جواب دیا، آپ کی گاڑی بہت سے بہت پانچ ہزار کی ہوگی، جبکہ میری لکڑی نو ہزار کی تھی۔ آپ نے تو پٹرول اور پنکچر جوڑنے کا خرچہ، خلیفہ کی تنخواہ اور اس کی زوجہ کا دین مہر بھی کار کی قیمت میں جوڑ دیا۔ بہت کچھ بحثا بحثی کے بعد واجب الادا رقم کا فرق گھٹ کر وہیں آ گیا، جہاں سے قضیہ شروع ہوا تھا۔ یعنی اب خان صاحب اس کلیم کے عوض یہ گاڑی چاہتے تھے۔

”خان صاحب آپ ۔ بزنس کر رہے ہیں یا بارٹر (barter) ؟“ بشارت نے جھنجلا کر پوچھا۔

”یہ کیا ہوتا ہے ،صیب ؟“

بشارت نے خان صاحب کی آسانی کے لئے بارٹر کا مفہوم سمجھایا۔ طول طویل تشریح سن کر بولے ”یارا جی! تو پھر سیدھا سیدھا وٹہ سٹہ کیوں نہیں کہتے، جس میں ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ وہ گھاٹے میں رہا۔“ اور یہی بھونڈی مثال برہانِ قاطع ثابت ہوئی۔ اس پر تصفیہ ہوگیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی اور اس طرح گلے ملے، جس طرح وہ دکھیارے ملتے ہیں، جو ایک دوسرے کے بہنوئی بھی ہوتے ہیں اور سالے بھی۔

لیکن بشارت دل ہی دل میں خوش تھے کہ کھٹارا گاڑی سات ہزار میں بِک گئی۔ خان صاحب ان سے بھی زیادہ خوش کہ دلدّر لکڑی کے عوض نو ہزار کی کار ہتھیالی۔ دونوں فریق اس صورتِ حال کو حق کی فتح سمجھ رہے تھے ،حالانکہ ہم سے دل کی بات پوچھیں، تو باطل نے باطل کو پچھاڑا تھا اور کوڑے کرکٹ کا تبادلہ کوڑے کرکٹ سے ہوا تھا۔

صبح چار بجے سے خان صاحب نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ فجر کی اذان کے بعد ایک اصیل مرغ کو قبلہ رو کر کے قربانی کی۔ اس کا سر، بلّی اور باقیات گھر والوں کو ناشتے میں کھلائیں۔ دل خود چاہا۔ بچے اُن کے جانے سے بہت اداس تھے۔ انھوں نے خود بھی اقرار کیا کہ میرا بھی جانے کو جی نہیں چاہتا، مگر کیا کروں، لکڑی کا کاروبار وہیں ہے۔ اگر کراچی میں جنگلات ہوتے، تو خدا کی قسم تم لوگوں کو چھوڑ کر ہرگز نہ جاتا۔ پھر انھوں نے ڈھارس بندھائی کہ ان شاءاللہ دو مہینے بعد پھر آؤں گا۔ ایک بوہری سیٹھ سے وصولی کرنی ہے، اکیلا آدمی ہوں۔ بوڑھا ہوگیا ہوں، ایک وقت میں ایک ہی بے ایمان سے نمٹ سکتا ہوں۔

بشارت کو مسکراتا دیکھ کر خود بھی مسکرا دیے ۔ ارشاد فرمایا، کراچی میں اُدھار پر بزنس بیوپار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کماد (گنے) کے کھیت میں کبڈی کھیلنا! جتنا بڑا شہر ہوگا اتنا ہی بڑا گھپلا اور پھڈا ہوگا۔ جس کی چھت زیادہ بڑی اس پر برف بھی زیادہ گرے گی۔

پھر سب سے چھوٹے بچے کو بہلانے کے لیے چارپائی پر لیٹ گئے۔

چلتے وقت انھوں نے بشارت کی بیٹی منیزہ کو جو ان کی چہیتی ہوگئی تھی پانچ سو روپے دیے۔ یہ اس کی پانچویں سالگرہ کا تحفہ تھا، جو آٹھ دن بعد منائی جانے والی تھی۔ ۷۳-۹-۳ روپے نوکروں میں تقسیم کیے۔ اس سے قبل، گزشتہ شب وہ ایک پٹھان نوجوان گل داؤد خان کو دو ہزار روپے دے چکے تھے تاکہ وہ اپنے چچا پر، جس نے اس کی زمینوں پر قبضہ غاصبانہ کر رکھا تھا کوہاٹ جا کر فوجداری مقدمہ دائر کرے اور اس کو یتیموں کی جائیداد پر قبضہ کرنے کی ایسی سزا دلوائے کہ سب چچاؤں کو عبرت ہو۔ ان تینوں رقموں کا حاصل جمع ۲۵۷۳-۹-۳ روپے بنتا ہے اور یہی وہ رقم تھی، جس کا سارا جھگڑا تھا اور جس کی وصولی کے لیے انھوں نے اپنے کمانڈوز اور بھیر و بنگاہ سمیت لشکرکشی کی تھی۔ بلکہ بقول مرزا، غنیم کے قلعے کے قلب میں تمبو تان کر بھنگڑا ڈال رکھا تھا۔

اس قضیے کو تیس سال ہونے کو آئے ۔ ہماری ساری عمر حساب کتاب میں ہی گزری ہے۔ مگر ہم آج بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ درحقیقت کس کی کس پر کتنی رقم نکلتی تھی اور آخر میں جیت کس کی رہی۔ ہماری ہی سمجھ کا قصور تھا۔ جنھیں ہم حریف سمجھے، وہ دراصل حلیف اور دوست نکلے ____ حسابِ دوستاں دَر دِل۔

خان صاحب کے جانے کے کوئی چھ سات ہفتے بعد، ان کا املا کرایا ہوا ایک خط موصول ہوا۔ لکھا تھا کہ ”بفضلِ خداوندی یہاں ہر طرح سے خیرت ہے۔ دیگر احوال یہ کہ میں نے اپنے دورانِ قیام میں آپ کو بتانا مناسب نہ سمجھا کہ ناحق آپ تردّد کرتے اور صحبت کا سارا لطف کرکرا ہو جاتا۔ پشاور سے میری روانگی سے تین ہفتے پیشتر ڈاکٹروں نے مجھے جگر کا سروسس بتایا تھا، دوسرے درجے میں ، جس کا کوئی علاج نہیں۔ جناح ہسپتال والوں نے بھی یہی تشخیص کی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ ہر وقت اپنا دل پشوری کرتے رہو۔ خود کو خوش رکھو اور ایسے خوش باش لوگوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارو، جن کی صحبت تمھیں بشاش رکھے۔ بس یہی تمھارا علاج اور خوگ ژوند (میٹھی زندگی) کا نسخہ ہے۔ یاراجی! میں بچہ نہیں ہوں، جو انھوں نے کہا وہ میں سمجھ گیا اور جو نہیں کہا وہ بھی بخوبی سمجھ گیا۔ یہ مشورہ تو مجھے کوئی طبلہ بجانے والا بھی مفت دے

سکتا تھا۔ اس کے لیے ایم۔آر۔سی۔پی اور ایف۔آر۔سی۔ایس ہونے اور جگہ بے جگہ ٹونٹی لگا کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

"میں نے لنڈی کوتل سے لانڈھی تک نگاہ ڈالی۔ آپ سے زیادہ مجبتی، خود خرسند رہنے اور دوسروں کا دل شاد کرنے والا کوئی بندہ نظر نہیں آیا۔ چنانچہ میں ٹکٹ لے کر آپ کے پاس آ گیا، باقی جو کچھ ہُوا وہ طبیعت کا زنگ اُتارنے کا بہانہ تھا۔ جتنے دن آپ کے ساتھ گزرے اتنے دنوں سے میری زندگی بڑھ گئی۔ خدا آپ کو اسی طرح شادمان اور مجھ پر مہربان رکھے۔ آپ کو میری وجہ سے جو تکلیف ہوئی، اس کی معافی مانگنا لکھنوی تکلفات میں شامل ہوگا، جو مجھ جیسے جاہل کے بس کا کام نہیں۔

"اس بیماری کا خانہ خراب ہو، عمر کا پیانہ لبریز ہونے سے پہلے ہی چھلکا جا رہا ہے۔ خط لکھوانے میں بھی سانس اکھڑ جاتی ہے۔ ڈر کے مارے ٹھیک سے کھانس بھی نہیں سکتا۔ آپ کی بھابی رونے لگتی ہے۔ مجھ سے چھپ کر وقفے وقفے سے گرج چمک کے ساتھ اشک باری کرتی ہے۔ بہتیرا سمجھاتا ہوں کہ بختاور! جب تک بالکل بے ہوش نہ ہو جاؤں، میں بیماری سے ہار ماننے والا آدمی نہیں۔ بشارت بھائی! ایسے آدمی کے لیے پشتو میں بہت برا لفظ ہے۔ گزشتہ ہفتے یونیورسٹی روڈ پر ایک نیا مکان بنوانا شروع کر دیا ہے۔ دالان میں پشاور کے پچاس یا کراچی کے سو شاعروں کے دو زانو بیٹھنے کی گنجائش ہوگی۔

باقی سب خیریت ہے۔ سب کو درجہ بدرجہ سلام، دعا، پیار اور ڈانٹ ڈپٹ"۔

بشارت پہلی ٹرین سے پشاور روانہ ہو گئے۔

(آبِ گُم)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

(الف) خان صاحب کس مقصد کے لیے کراچی آئے تھے؟

(ب) خان صاحب کی خوش خوراکی کا حال اپنے الفاظ میں لکھیں؟

(ج) بشارت نے خان صاحب کی بھیجی ہوئی لکڑی میں کیا نقائص گنوائے؟

(د) بشارت اور خان صاحب کے درمیان تنازعہ کیسے طے ہوا؟

(ہ) خان صاحب نے اپنے خط میں کیا لکھا تھا؟

(و) خان صاحب نے وٹہ سٹہ کا کیا مفہوم بتایا؟

۲۔ خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) بشارت خان صاحب کے خلوص و مدارات کے ________ تھے۔

(ب) خان صاحب ________ اور بھاری بھرکم آدمی تھے۔

(ج) کلوروفارم سُونگھنے کو مَردوں کی ________ کے خلاف سمجھتے تھے۔

(د) اس جنگ میں فتح کسی کی بھی ہو ________ صرف سچائی ہوتی تھی۔

(ہ) وٹہ سٹہ میں ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ وہ ________ میں رہا۔

(و) خان صاحب نے منیزہ کو اس کی سالگرہ پر ________ کا تحفہ دیا۔

۳۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

(الف) اُن کے دسترخوان پر کبھی سبزی یا مچھلی نہیں دیکھی، جس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ بینگن اور

مچھلی کی ٹانگیں نہیں ہوتیں۔

(ب) اس بیماری کا خانہ خراب ہو۔ عمر کا پیمانہ لبریز ہونے سے پہلے ہی چھلکا جا رہا ہے۔

(ج) ہنگامِ قتال اگر وہ اس پر صرف گر پڑتے تو وہ پانی بھی نہ مانگتا۔ ہاتھ پاؤں مارے بغیر وہیں دم گھٹ کے ڈھیر ہو جاتا۔

۴۔ خان صاحب کے کردار پر ایک مفصّل نوٹ لکھیں۔

۵۔ اس مضمون کے حوالے سے مشتاق احمد یوسفی کے طرزِ تحریر پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔

۶۔ تابع جملوں کی قِسم "وصفی" پر مشتمل پانچ جملے لکھیں۔

۷۔ درج ذیل الفاظ پر دیے گئے معنی کے مطابق اعراب لگائیں

بکری (مویشی)	بکری (فروخت)
جلانا (آگ میں ڈالنا)	جلانا (تازگی دینا، زندہ کرنا)
جو (نہر)	جو (غلہ)
وتر (نماز)	وتر (مثلث کا حصہ)

۸۔ درج ذیل محاورات اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

زمین میں گڑ جانا۔ آسمان ٹوٹ پڑنا۔ ہوائی قلعے بنانا۔ چراغ سحر ہونا۔ طوطا چشمی کرنا۔
اینٹ سے اینٹ بجانا۔ نشہ ہرن ہو جانا۔ ناکوں چنے چبوانا۔ پہاڑ ٹوٹ پڑنا۔
تین حرف بھیجنا۔

حِصّہ نظم

تدریسی مقاصد برائے حصہ نظم:

حصہ نظم/غزل پڑھنے کے بعد طلبہ اس قابل ہوسکیں گے کہ وہ:

* منظوم اور منثور کلام کی حسن و قبح کے ساتھ پہچان کرسکیں
* فنی حوالے سے نظم کی مختلف اقسام کی پہچان کرسکیں۔
* کلام میں موجود ادبی محاسن (علم بیان وعلم بدیع) کی پہچان کرسکیں۔
* کسی بھی کلام کا مرکزی خیال یا خلاصہ آسانی سے کرسکیں۔
* ہیت کے لحاظ سے مطلع ،مقطع ، قافیہ،ردیف، وزن اور سادہ بحر کی شناخت کرسکیں۔
* اشعار کی فنی نزاکتوں سے لطف اندوز ہوسکیں اور نصابی کتب کے علاوہ دیگر ادبی کتب و رسائل پڑھنے کا ذوق پیدا کرسکیں۔

علّامہ اقبالؒ

ولادت: ۱۸۷۷ء

وفات: ۱۹۳۸ء

شیخ محمد اقبالؒ سیالکوٹ کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ روایات کے مطابق اقبالؒ کی ابتدائی تعلیم دینی مدرسے میں ہوئی۔ انگریزی سکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور مرے کالج میں داخل ہوگئے ۔ یہاں اُنھیں مولوی سید میر حسن جیسا اُستاد میسر آیا۔اقبال کو فارسی اور عربی کا صحیح ذوق اُنھیں کی بدولت حاصل ہوا۔ ایف ۔اے کرنے کے بعد وہ گورنمنٹ کالج لاہور چلے گئے، وہاں بھی اُنھیں پروفیسر آرنلڈ جیسا شفیق اُستاد ملا۔ جن کی وجہ سے اقبال کی خُفیہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ اسی کالج سے ایم اے کرنے کے بعد اُنھوں نے کچھ عرصہ یہاں تدریس کے فرائض انجام دیے، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے اور وہاں بیرسٹری اورفلسفہ میں ڈاکٹریٹ کیا۔ واپس آنے کے بعد اُنھوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ مگر اس پیشے سے طبیعت جلد اُچاٹ ہوگئی۔ علامہ اقبالؒ نے کچھ عرصہ سیاست میں بھی دلچسپی لی۔ ایک مرتبہ جب مسلم لیگ کی صدارت کے لیے اُن کا نام تجویز ہوا، تو اُنھوں نے اپنی بجائے قائداعظم محمد علی جناحؒ کو اس منصب کا اہل قرار دیا۔ علّامہ اقبالؒ کا ایک اہم کارنامہ ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسے میں قیامِ پاکستان کی تجویز ہے۔آخری عمر میں مختلف بیماریوں نے آن گھیرا اور وہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ کو خالقِ حقیقی سے جاملے۔

اقبالؒ وہ ہستی ہیں، جن پر نہ صرف ایشیا بلکہ پوری دُنیا فخر کرتی ہے۔اُنھوں نے شاعری کا آغاز تو سکول کے زمانے سے کیا تھا، لیکن دورۂ یورپ کے بعد صحیح معنوں میں اُن کے موضوعات کا تعین ہوگیا۔اُنھوں نے تاریخ عالم کا مطالعہ کیا تھا، اِس لیے وہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب سے آگاہ تھے۔

اُنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے حرکت وعمل کا پیغام دیا۔اُن کا فلسفۂ خودی اور تصوّرِ مردِ مومن مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ بن گیا۔اُردو کے روایتی شعرا کے برعکس اقبالؒ نے اُردو شاعری کو نئے موضوع، خیالات، اسلوب اور فلسفیانہ خیالات سے روشناس کرایا۔ اُن کا مشاہدہ بے حد قوی تھا۔ منظرنگاری پر اُنھیں عبور حاصل تھا۔ غرض اقبالؒ کی شاعری روایت اور جدت کا بہترین امتزاج ہے۔ اپنی بے پناہ شاعرانہ خصوصیات کے باعث اُنھیں شاعرِ مشرق، حکیم الامت، اور نباضِ فطرت کہا جاتا ہے۔ اقبالؒ کو عربی اور فارسی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا اُنھوں نے اپنے کلام میں قرآنی آیات کا استعمال بڑی خوب صورتی سے کیا ہے۔اس کے علاوہ اُن کے کلام کا ایک بڑا حصہ فارسی زبان پر مشتمل ہے۔ اقبالؒ کے آفاقی نظریات زیادہ تر اُن کے فارسی کلام میں موجود ہیں۔

تصانیف: بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز، زبورِ عجم، جاوید نامہ، اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، مسافر، پیامِ مشرق، علم الاقتصاد (نثر) وغیرہ

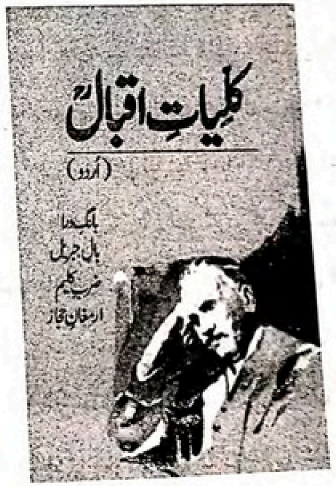

جوابِ شکوہ

1911ء میں علامہ اقبالؒ نے اپنی شہرہ آفاق نظم "شکوہ" لکھی جس میں مسلمانوں کی شان وشوکت کے بعد اُن کے زوال کا ذکر کیا ہے ۔ اس نظم میں اقبالؒ نے مسلمانوں کے زوال پر اُن کی زبانی اللہ تعالیٰ سے شکوہ کیا ہے ۔ "جوابِ شکوہ" اُنھوں نے 1913ء میں لکھی، جس میں "شکوہ" کا جواب دیا گیا ہے اور مسلمانوں کے زوال کے اصل اسباب کو قرآن وسنت کی روشنی میں ترتیب وار بیان کیا گیا ہے۔یہی اس نظم کی خوبی ہے۔لہٰذا یہ نظم پڑھانے سے پہلے "شکوہ" کے چند بند جماعت میں پڑھ کر سنائیں جائیں تاکہ طلبہ کو "جوابِ شکوہ" سمجھنے میں آسانی رہے۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے، رفعت پہ نظر رکھتی ہے
خاک سے اُٹھتی ہے، گردوں پہ گزر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بیباک مرا

پیرِ گردوں نے کہا سن کے، کہیں ہے کوئی !
بولے سیارے، سرِ عرشِ بریں ہے کوئی !
چاند کہتا تھا، نہیں، اہلِ زمیں ہے کوئی !
کہکشاں کہتی تھی، پوشیدہ یہیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھے جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا!
عرش والوں پہ بھی کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا!
تا سرِ عرش بھی انساں کی تگ و تاز ہے کیا؟
آگئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا ؟
غافل آداب سے سُکّانِ زمیں کیسے ہیں!
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں!

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے / تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے؟
عالمِ کیف ہے، دانائے رموزِ کم ہے / ہاں، مگر عجز کے اَسرار سے نا محرم ہے
ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا / اشکِ بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا / کس قدر شوخ زباں ہے دل دیوانہ ترا
شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں / راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے، جوہرِ قابل ہی نہیں / جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہیں / اُمتی باعثِ رسوائی پیغمبرؐ ہیں
بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں / تھا براہیمؑ پدر اور پسر آزر ہیں
بادہ آشام نئے، بادہ نیا، خُم بھی نئے
حرمِ کعبہ نیا، بت بھی نئے، تم بھی نئے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟ / نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟ / میرے قرآن کو سینے سے لگایا کس نے؟
تھے تو آبا وہ تمھارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو!

کیا کہا؟ بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور / شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور!
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور / مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور
تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰؑ ہی نہیں

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے / نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے / پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

مثلِ بو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا / رختِ بر دوشِ ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ، تو ذرے سے بیاباں ہو جا / نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے / تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدریؓ فقر ہے، نے دولتِ عثمانیؓ ہے / تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری / مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری / تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

(بانگِ درا)

مشق

۱۔ نظم کے مطابق درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

(ا) علامہ اقبالؒ کی یہ نظم کس ہیئت میں لکھی گئی ہے؟

ب۔ "شکوہ" سُن کر فرشتوں نے کن خیالات کا اظہار کیا؟

ج۔ اس نظم میں موجودہ دور کے مسلمانوں کی کن کمزوریوں اور خامیوں کا ذکر ہے؟

د۔ اس نظم سے ایسے مصرعے چُن کر لکھیں جن میں صنعتِ تلمیح کا استعمال ہو۔

ہ۔ اس نظم کا نام "جوابِ شکوہ" کیوں رکھا گیا ہے؟

و۔ "بُت بھی نئے" کی تشریح کریں۔

ز۔ آخری بند میں کس چیز کو مسلمان کی شمشیر کہا گیا ہے؟

ح۔ امتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسوائی کا کیسے باعث بنتے ہیں؟

ط۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرنے کا کیا انعام ہے؟

ی۔ دنیا میں کس کے نام کی برکت سے روشنی کرنے کی تلقین کی گئی ہے؟

۲۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگائیں:

منفعت، مصلحت، رمضان، اسرار، سپر۔

۳۔ وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

کلام میں دو چیزوں کا ذکر کرکے دونوں کے درمیان فرق بتانے کو صنعتِ تفریق کہتے ہیں۔اس نظم میں کم از کم تین ایسے اشعار تلاش کر کے لکھیں جن میں صنعتِ تفریق موجود ہو۔

NOT FOR SALE

۴۔ درست لفظ چن کر خالی جگہ پر کریں۔

(ا) جوابِ شکوہ" دراصل اقبالؒ کی ایک اور نظم ______ کا جواب ہے۔
(ساقی نامہ، خضرِ راہ، شکوہ، طلوعِ اسلام)

ب۔ آئی آواز غم انگیز ہے ______ تیرا (افسانہ، پیمانہ، دیوانہ، مے خانہ)

ج۔ قدسی الاصل ہے ______ یہ نظر رکھتی ہے (دولت، ثروت، رفعت، قدرت)

د۔ بات کرنے کا سلیقہ نہیں ______ کو (انسانوں، نادانوں، دیوانوں، حیوانوں)

۵۔ اس نظم میں سے کم از کم دس ہم قافیہ الفاظ چن کر لکھیں۔

۶۔ اس نظم میں جو فارسی تراکیب استعمال ہوئی ہیں ان میں سے کم از کم دس تراکیب لکھیں۔

نظم:

۱۔ نظم کے لفظی معنی ہیں "پرونا" جیسے موتی لڑی میں پروئے جاتے ہیں۔ادب کی رُو سے اشعار کے مجموعے کو نظم کہتے ہیں۔

۲۔ "کسی ایک خیال یا موضوع کے تحت لکھے گئے اشعار کو نظم کہتے ہیں"۔

پابند نظم:

اس نظم میں وزن اور بحر کے ساتھ ساتھ قافیہ اور بسا اوقات ردیف کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے۔

NOT FOR SALE

اختر شیرانی

ولادت: ۱۹۰۵ء

وفات: ۱۹۴۸ء

اختر شیرانی کا اصل نام محمد داؤد خاں تھا اور اختر تخلص کرتے تھے ۔ وہ مشہور عالم، محقق، ماہرِ تعلیم اور نقاد حافظ محمود شیرانی کے بیٹے تھے۔ اختر شیرانی ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد ٹونک سے لاہور منتقل ہوگئے۔ اُنھوں نے لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ اورینٹل کالج لاہور سے منشی فاضل اور ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد مختلف ادبی رسائل سے وابستہ رہے۔

اختر نے کم عمری سے ہی شعر کہنے شروع کیے۔ اُن کی طبیعت میں شوخی اور رنگینی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اُنھیں مناظرِ قدرت سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ اپنے دور کے ایک اہم رومانی شاعر تھے، لیکن اُن کی رومانیت سے جذبات کو منہا نہیں کیا جاسکتا۔ اچھی شاعری میں جس طرح کی تہہ داری ہوتی ہے، وہ اُن کے ہاں نظر نہیں آتی، لیکن وہ اس لحاظ سے خوش قسمت شاعر ہیں کہ اُن کے اشعار زبان زدِ عام ہیں۔ اُن کی شاعری کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اُن کے ہاں عورت کوئی ماورائی چیز نہیں بلکہ عام انسان ہے اور اُس کے رویوں میں کوئی غیر فطری عناصر نہیں ہیں۔ اُن کے نزدیک شاعری ایک ایسا جذبہ ہے جو عاشقانہ تنہائیوں کی پیداوار ہے۔ اختر ایک باشعور فنکار ہیں، اُنھوں نے مروجہ اسالیب سے گریز کرتے ہوئے ہیئت کے مختلف تجربے کیے ہیں۔

مجموعۂ کلام: (کلیاتِ اختر شیرانی)

بڑھے چلو

رُکو نہیں، جو دشت و ریگزار آئیں سامنے
بچو نہیں، جو سیل و جوئے بار آئیں سامنے
ہٹو نہیں، جو بحر و کوہسار آئیں سامنے
ہو راہ کتنی ہی کٹھن بڑھے چلو، بڑھے چلو،
دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن بڑھے چلو، بڑھے چلو

تمھاری تیغ تیز پر وطن کو افتخار ہے
وطن کی مرگ و زیست کا تمھیں پہ انحصار ہے
تمھیں ہو جن کے دل میں اس کا عشق بے قرار ہے
لگائے دل میں اک لگن بڑھے چلو، بڑھے چلو
دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن بڑھے چلو، بڑھے چلو

اٹھاؤ تیغِ بے اماں، وطن کے پاک نام پر
لٹا دو عمرِ نوجواں، وطن کے پاک نام پر
نثار کر دو اپنی جاں، وطن کے پاک نام پر
صدائیں دیتا ہے وطن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن بڑھے چلو، بڑھے چلو

سپاہیانہ زندگی جو قسمتِ سعید ہے
تو رزم گہ کی موت بھی سپاہیانہ عید ہے
جیا تو فخرِ قوم ہے، مرا تو وہ شہید ہے
سروں سے باندھ کر کفن بڑھے چلو، بڑھے چلو
دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن بڑھے چلو، بڑھے چلو

لالۂ طور: حصہ سوم

مشق

۱۔ نظم کے مطابق درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

ا۔ وطن کے نام پر کن چیزوں کو قربان کر دینے کی تلقین کی گئی ہے؟

ب۔ اس نظم کا مرکزی خیال تحریر کریں۔

ج۔ پہلے بند میں کن کن مشکلات کے باوجود آگے بڑھنے کی نصیحت کی گئی ہے؟

د۔ وطن کی ترقی وتنزلی کا انحصار کس چیز پر بیان کیا گیا ہے؟

ہ۔ ''سروں پر کفن باندھنے'' سے کیا مراد ہے؟

۲۔ مندرجہ ذیل مرکبات کا مفہوم واضح کریں:

سیل وجوئبار۔ مرگ وزیست۔ تیغ بے اماں۔ قسمتِ سعید۔ فخرِ قوم۔ تیغ زن۔ رزم گاہ۔ صف شکن۔

۳۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگا کر تلفظ واضح کریں۔

صف شکن۔ کفن۔ رزم۔ دشت۔ بحر۔ دلاور۔ افتخار۔ بہادر۔

۴۔ نظم کے مطابق درست جملوں کے سامنے (✓) اور غلط کے سامنے (✗) کا نشان لگائیں:

ا۔ گل وگلزار بھی راستے میں آئیں تو بڑھے چلو

ب۔ دلوں میں ایک جذبہ پیدا کر کے آگے بڑھنا چاہیے۔

ج۔ بہادر لوگوں کو بزدلوں کا حوصلہ بڑھانا چاہیے۔

د۔ وطن کے پاک نام پر اپنی جان بھی قربان کر دینی چاہیے۔

ہ۔ میدانِ جنگ کی موت بھی سپاہی کے لیے خوشی کا باعث ہوتی ہے۔

و۔ وطن پکار رہا ہے کہ آگے بڑھے چلو۔

ز۔ امیر لوگوں کو غریبوں کی مدد کرنی چاہیے۔

مسدس ترجیع بند:

مسدس کے ہر بند کا تیسرا شعر اگر مِن وعَن دُہرایا جائے تو اسے ٹیپ کا شعر اور ایسی مسدس کو مسدس ترجیع بند کہتے ہیں۔ ''نظم بڑھے چلو'' بھی مسدس ترجیع بند کی مثال ہے۔

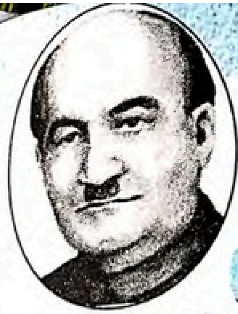

جوشؔ ملیح آبادی

ولادت: ۱۸۹۶ء

وفات: ۱۹۸۲ء

جوشؔ کا اصل نام شبیر حسن خان تھا۔ وہ ملیح آباد (لکھنؤ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام بشیر احمد بشیر تھا جو خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ نسلاً آفریدی تھے۔ آباو اجداد کا تعلق وادیِ تیراہ سے تھا۔ جوشؔ نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر حاصل کی اور عربی فارسی پر اچھی خاصی دسترس حاصل کر لی۔ اس کے بعد سینٹ پیٹرس کالج آگرہ سے مزید تعلیم حاصل کی۔ جوشؔ کا تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے تھا، لیکن والد کے انتقال سے سارا خاندان انتشار کا شکار ہوگیا۔

تلاشِ معاش کے سلسلے میں کافی پریشان رہے۔ آخر کار دارُالترجمہ (جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد) میں ملازمت اختیار کی، لیکن نظام حیدرآباد کے خلاف ایک نظم لکھنے کی پاداش میں معتوب ہو کر ریاست بدر ہوئے اور دہلی منتقل ہوگئے۔ وہاں وہ مختلف رسائل سے منسلک رہے۔ کچھ عرصہ فلمی دنیا اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی وابستہ رہے۔ ادبی خدمات کے صلے میں ہندوستانی حکومت نے انھیں سب سے بڑا ادبی اعزاز "پدما بھوشن" عطا کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی میں رہائش اختیار کی۔ ان کا انتقال اسلام آباد میں ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔

جوشؔ کو ادبی ماحول ورثے میں ملا تھا۔ انھوں نے شعر گوئی کی ابتدا تقریباً نو سال کی عمر سے کی۔ ابتدا میں اُنھوں نے غزلیں کہیں، لیکن جلد ہی وہ نظم کی طرف مائل ہوگئے۔ نظم نگاری میں انھیں ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ ان کی نظموں میں مناظرِ فطرت کی عکاسی، انقلابی رنگ اور شباب کی ولولہ انگیزی

پائی جاتی ہے۔ اس لیے اُنھیں شاعرِ فطرت اور شاعرِ انقلاب بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نظموں میں سیاسی رنگ بھی ہے اور احتجاجی عنصر بھی نمایاں ہے۔ جوشؔ کو الفاظ پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ ان کا ذخیرہ الفاظ بہت وسیع تھا۔ ان کے لہجے میں ایک خاص گھن گرج اور بہاؤ ہے۔ شعری وسائل کے فنکارانہ استعمال سے جوش نے اپنے کلام میں دلکشی اور رعنائی پیدا کی ہے۔ وہ کسی بھی موضوع پر مسلسل اور مفصّل لکھنے پر قادر تھے۔

مجموعہ ہائے کلام: شعلہ و شبنم، روحِ ادب، نقش ونگار، فکر ونشاط، حرف و حکایات، آیات ونغمات، سیف وسبو، عرش وفرش، یادوں کی بارات (خودنوشت) وغیرہ

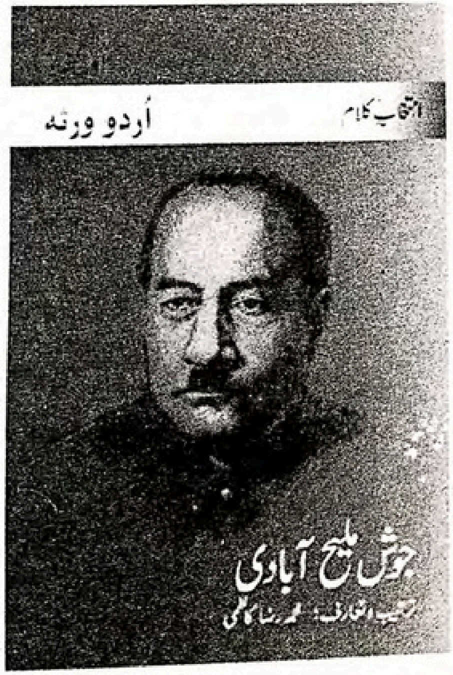

مناظرِ سحر

کیا روح فزا جلوہ، رخسارِ سَحر ہے — کشمیر دلِ زار ہے فردوس نظر ہے
ہر پھول کا چہرہ عرقِ حسن سے تر ہے — ہر چیز میں اک بات ہے ہر شے میں اثر ہے
ہر سَمت بھڑکتا ہے رُخِ حُور کا شعلہ
ہر ذرۂ ناچیز میں ہے طُور کا شعلہ

لرزش وہ ستاروں کی وہ ذروں کا تبسّم — چشموں کا وہ بہنا کہ فدا جن پہ ترنم
گردُوں پہ سپیدی و سیاہی کا تصادم — طوفان وہ جلوؤں کا وہ نغموں کا تلاطم
اُڑتے ہوئے گیسو وہ نسیمِ سَحری کے
شانوں پہ پریشان ہیں یا بال پری کے

وہ پھیلنا خوشبو کا وہ کلیوں کا چٹکنا — وہ چاندنی مدھم، وہ سمندر کا جھلکنا
وہ چھاؤں میں تاروں کی گلِ تر کا مہکنا — وہ جھومنا سبزہ کا، وہ کھیتوں کا لہکنا
شاخوں سے ملی جاتی ہیں شاخیں وہ اثر ہے
کہتی ہے نسیمِ سحری "عیدِ سحر ہے"

خنکی وہ بیاباں کی، وہ رنگینیٔ صحرا — وہ وادیٔ سرسبزہ و تالاب مصفا
پیشانی گردوں پر، وہ ہنستا ہوا تارا — وہ راستے جنگل کے، وہ بہتا ہوا دریا
ہر سَمت گلستاں میں وہ انبار گلوں کے
شبنم سے وہ دھوئے ہوئے رخسار گلوں کے

وہ روح میں انوارِ خدا، صبح وہ صادق — وہ حسن جسے دیکھ کے ہر آنکھ ہو عاشق
وہ سادگی انسان کی فطرت کے مطابق — زریں وہ اُفق، نور سے لبریز وہ مشرق
وہ نغمہء داؤدؑ پرندوں کی صدا میں
پیراہنِ یوسفؑ کی وہ تاثیر ہوا میں

وہ برگِ گلِ تازہ، وہ شبنم کی لطافت — اِک حُسن سے وہ خندہ سامانِ حقیقت
وہ جلوۂ اصنام، وہ بت خانہ کی زینت — زاہد کا وہ منظر، وہ برہمن کی صباحت
ناقوس کے سینے سے صدائیں وہ فغاں کی
وہ حمد میں ڈوبی ہوئی آواز اذاں کی

آقا کا غلاموں سے یہ ہے قرب کا ہنگام! — دل ہوتے ہیں سرشار فنا ہوتے ہیں آلام
چھا جاتی ہے رَحمت، تو برس پڑتے ہیں انعام — اس وقت کسی طرح مناسب نہیں آرام
رونے میں جو لذت ہے تو آہوں میں مزا ہے
اے روح! خودی چھوڑ کہ نزدیک "خدا" ہے

(بحوالہ۔ دیوانِ جوشؔ (طبع اوّل) مرتب آمرؔ، اُردو اکادمی قیصر باغ)

مشق

۱۔ مناظرِ سحر میں پیش کیا گیا صبح کا منظر اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۲۔ جوشؔ کو شاعرِ فطرت کہا جاتا ہے۔ اس نظم کے حوالے سے وضاحت کریں۔

۳۔ نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

۴۔ بند نمبر ۳ میں کن اشیا کو ''عیدِ سحر'' سے تعبیر کیا گیا ہے؟

۵۔ بند نمبر ۵ میں ''انوارِ خدا'' سے کیا مراد ہے؟

۶۔ صنعتِ تلمیح سے مراد کلام میں کسی مشہور تاریخی واقعہ یا علمی اصطلاح کو نظم کرنا ہے۔
آپ اس نظم سے دو تلمیحات کی نشاندہی کریں اور وضاحت بھی پیش کریں۔

تمیز یا متعلق فعل:

وہ الفاظ جو فعل کی کیفیت یا حالت میں تھوڑی سی کمی بیشی کرتے ہیں۔
چند تمیزی الفاظ درج ذیل ہیں:
کبھی، کبھی کبھی، کبھی نہیں، کبھی نہ کبھی، ہمیشہ، اکثر، عموماً، آئے دن، روز روز، یکا یک، اچانک، جلد، جلدی وغیرہ وغیرہ۔ درج بالا تمیزی الفاظ سے دو دو جملے بنائیں۔

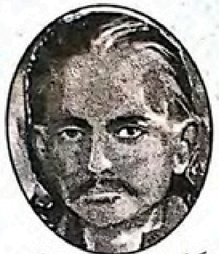

میراؔ جی

ولادت: ۱۹۱۲ء

وفات: ۱۹۴۹ء

اصل نام محمد ثنا اللہ ڈار اور تخلص میراؔ جی تھا۔ اُن کے آباؤاجداد کا تعلق کشمیر سے تھا جو ڈوگرہ راج میں ہجرت کرکے گوجرانوالہ میں آباد ہو گئے تھے جب کہ میراؔ جی کی پیدائش لاہور میں ہوئی۔ چونکہ اُن کے والد منشی مہتاب الدین ریلوے میں ملازم تھے اور مختلف مقامات پر ڈیوٹی انجام دیتے رہے اس لیے میرا جی باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ میٹرک کا امتحان بھی پاس نہ کر سکے لیکن مطالعے کا شوق جنون کی حد تک تھا اور وہ اپنے طور پر مطالعہ کرتے رہے۔

اس عرصے میں لاہور میں حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ حلقے کے قیام کے چار سال بعد میرا جی اس میں شامل ہوئے۔ اُن کی شمولیت سے حلقے میں جان پڑ گئی۔ میرا جی حلقے کے سرگرم کارکن اور منتظم رہے ہیں۔ وہ حلقے کے قواعد وضوابط کی خود بھی پابندی کرتے اور دوسروں سے بھی کرواتے۔

میرا جی کی ساری عمر محرومیوں میں گزری جس کا مداوا اُنھوں نے شاعری میں تلاش کیا۔ اُنھوں نے اُردو نظم کو چکا چوند روشنی سے نکال کر نیم روشن سایوں سے متعارف کرایا۔ وہ اپنی شاعری میں زندگی کی مکمل اور واضح تصویر کی بجائے ایسے دائرے اور خطوط بناتے ہیں کہ واضح ہونے کے باوجود بھی اُس پر ابہام کا پردہ پڑا رہتا ہے۔

مغربی شعرا کے مطالعے سے اُنھیں جدید شاعری میں نئے تجربات کرنے کا خیال آیا اور یہ تجربات کامیاب رہے۔ اُنھوں نے ان تجربات کو ''ادبی دُنیا'' اور حلقہ اربابِ ذوق میں پروان چڑھایا۔ وہ ایک ایسے شاعر ہیں جس کی جڑیں اپنی دھرتی میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی نظموں میں ہندوستانی تہذیب کا ارضی پہلو نمایاں ہے۔ اُنھوں نے نظم کو خارجی حقیقت نگاری سے نکال کر انسانی باطن میں اُتارا اور نظم کی ایک سطحی معنویت کو ہمہ جہت بنایا۔

مجموعہ ہائے کلام میراؔجی کے گیت، میراؔجی کی نظمیں، گیت ہی گیت، تین رنگ، پابند نظمیں۔

شکست کی آواز

اُمنگوں نے مرے دل کو عجب اُلجھن میں ڈالا ہے
سمجھتا ہے کہ جو بھی کام ہے وہ کرنے والا ہے

یہ کہتا ہے نئے رستے دکھاؤں میں سواروں کو
یہ کہتا ہے کہ لے آؤں فلک سے ماہ پاروں کو

یہ کہتا ہے کہ صحراؤں کی دوری طے کروں پل میں
حقیقت میں، یہ احساسِ شعوری طے کروں پل میں

جہانِ نَو کو دیکھ آؤں جو ہے قلبِ سمندر میں
بیانِ سنگ پالوں منجمد ہے کوہ کے سر میں

یہ کہتا ہے کہ ساری کائنات اک ذرہ بن جائے
جو ہے لا انتہا وقفہ وہ بس اک لمحہ بن جائے

مگر اُونچے ارادے ہیں تو کیا، اُونچے ارادوں کو
سمجھنے کا نہیں احساس حاصل سیدھے سادوں کو

جہاں میں سیدھے سادے آدمی کثرت سے بستے ہیں
ہے محدود اُن کی ہمت اور محدود اُن کے رستے ہیں

NOT FOR SALE

تمدن اور تہذیبوں نے پھندا اُن پہ ڈالا ہے
وہ کہتے ہیں کہ ہونا ہے وہی جو ہونے والا ہے

بدل کر کیا کریں گے ہم طریقے آج قدرت کے
ہمارے دامنوں پر ہاتھ کل ہوں گے مشیت کے

انھیں تسکین ہے پہلی لکیروں کی فقیری میں
یہ کھوئے ہیں تمنّا کی ضعیفی اور پیری میں

میں اُن کو دیکھتا ہوں دل پہ ہوتا ہے اثر اُن کا
میں اک مظلوم ہوں ماحول کے اس جذبِ ساکن کا

مگر ہاں باوجود اس کے مرے دل میں اُجالا ہے
اُمنگوں نے مری ہستی کو اک اُلجھن میں ڈالا ہے۔

(پابند نظمیں)

NOT FOR SALE

مشق

ا۔ نظم کے مطابق درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

ا۔ اس نظم کا مرکزی خیال لکھیں۔

ب۔ شاعر اپنے دل کی کس امنگ کا ذکر کرتا ہے؟

ج۔ آسمان سے کن کو لانے کی خواہش کا اظہار کیا گیا ہے؟

د۔ جہانِ نو کہاں واقع ہے؟

ہ۔ دنیا میں زیادہ تر لوگ کس قسم کے ہیں؟

و۔ یہ خواہش کیوں کی گئی ہے کہ کائنات ایک ذرہ بن جائے؟

ز۔ قدرت کے طریقے بدلنے میں کیا چیز حائل ہے؟

ح۔ ''لکیر کا فقیر'' سے کیا مراد ہے؟

ط۔ شاعر کی ذات میں الجھاؤ کی کیا وجہ ہے؟

ی۔ اس نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

۲۔ تشریح کریں۔

مگر ہاں باوجود اس کے مرے دل میں جو جوالا ہے
اُمنگوں نے مری ہستی کو اک اُلجھن میں ڈالا ہے

۳۔ ''لکیر کا فقیر ہونا'' محاورہ ہے۔ محاورہ کی تعریف کریں اور کوئی سے پانچ محاورات لکھیں۔

ن۔م۔ راشد

ولادت: ۱۹۱۰ء | وفات: ۱۹۷۵ء

ن۔م۔ راشد کا اصل نام راجا نذر محمد جنجوعہ تھا۔ وہ علی پور چٹھہ (گوجرانوالہ) کے گاؤں کوٹ بھاگاں میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے اقتصادیات میں ایم۔اے کرنے کے بعد اقتصادی بد حالی کا ایک طویل دور گزارا۔ بالآخر تقدیر اُن پر مہربان ہوگئی اور وہ یو۔این۔او سے منسلک ہوگئے۔ انھوں نے کئی ممالک میں کام کیا۔ عمر کا آخری حصہ بیرونِ ملک گزارا اور وہیں وفات پائی۔ ن۔م۔راشد اُردو کی روایتی شاعری سے فنی اور معنوی انحراف کی ایک انوکھی مثال ہیں۔ وہ سخت اور کھردرے جذبات کے شاعر ہیں۔ نظم کے مروجہ روایتی سانچے اُن کے فکر و فن کا ساتھ دینے سے یکسر قاصر تھے۔ چنانچہ وہ ایک نیا رنگ لے کر اُبھرے۔

راشد جدید اُردو نظم کے اوّلین معماروں میں سے ہیں۔ اُن کے تخلیقی ذہن نے نظم کے مرّوجہ سانچوں کو قبول نہیں کیا۔ اُنھوں نے نظم میں ہیئت کے متعدد تجربے کیے، اگرچہ اُن کی نظموں کی ہیئت اور تکنیک اُردو نظم کے قاری کے لیے نئی اور انوکھی چیز ہے، لیکن اُنھوں نے زبان کے کلاسیکی اسلوب کو بھی مدِّنظر رکھا۔ اُنھوں نے قوافی کا ایک ایسا نظام مرتب کیا جو نظموں کی داخلی ضرورت نظر آتی ہے۔ اقبال کے عہد تک پہنچتے پہنچتے اُردو نظم میں کئی ایک فنی و فکری تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں لیکن بہر حال اُردو نظم سیدھی سادی اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی چیز تھی۔ راشد کی نظمیں اس کے برعکس پیچیدگی اور ابہام لیے ہوئے ہیں۔ اُن کی نظم سادہ اور بیانیہ نہیں ہے بلکہ اُن کی نظموں میں ڈرامائی اور افسانوی انداز ہے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے علامت نگاری سے بھی خوب کام لیا، اس لیے اکثر اوقات قاری کے لیے اُن کی نظموں کے معنی اور مفہوم کی تہ تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اُن کے بارے میں کئی ایک نقادوں کا خیال ہے کہ وہ آج کے نہیں بلکہ آنے والے کل کے شاعر ہیں۔

مجموعہ ہائے کلام: ماورا، ایران میں اجنبی، لا= انسان، گماں کا ممکن۔

ستارے

(سانیٹ)

نکل کر جُوئے نغمہ خُلد زارِ ماہ و انجم سے
فضا کی وسعتوں میں ہے رواں آہستہ آہستہ
بہ سُوئے نوحہ آبادِ جہاں آہستہ آہستہ
نکل کر آرہی ہے اک گلستانِ ترنّم سے !

ستارے اپنے میٹھے مدبھرے ہلکے تبسّم سے
کیے جاتے ہیں فطرت کو جواں آہستہ آہستہ
سُناتے ہیں اسے اک داستاں آہستہ آہستہ
دیارِ زندگی مدہوش ہے اُن کے تکلّم سے!

یہی عادت ہے روزِ اوّلیں سے ان ستاروں کی
چمکتے ہیں کہ دُنیا میں مسرّت کی حکومت ہو
چمکتے ہیں کہ انساں فکرِ ہستی کو بُھلا ڈالے

ا لیے ہے یہ تمنا ہر کرن ان نور پاروں کی
کبھی یہ خاک داں گہوارۂ حسن و لطافت ہو
کبھی انسان اپنی گُم شدہ جنّت کو پھر پالے !

(کلیاتِ راشدؔ، لاہور، ماورا پبلشرز بار دوم 1991ء)

مشق

۱۔ اس نظم کا خلاصہ لکھیں۔
۲۔ رات کے وقت آسمان پر جگمگاتے ستاروں کا منظر اپنے الفاظ میں بیان کریں۔
۳۔ نظم ''ستارے'' کا مرکزی خیال لکھیں۔
۴۔ شاعر کے مطابق ستاروں کی روزِ اوّلیں سے کون سی عادت ہے؟
۵۔ اِس نظم سے مرکبِ اضافی اور مرکبِ عطفی الگ الگ کر کے لکھیں۔
۶۔ ''گُم شدہ جنت'' سے شاعر کی کیا مُراد ہے؟

*ن۔م۔راشدؔ نے سانیٹ کی ہیئت میں بھی تجربے کیے ہیں۔ درج بالا سانیٹ کے آخری چھے مصرعوں کو دو بند میں تقسیم کر کے ہر بند کی ترتیب ج۔د۔ر رکھ دی ہے۔

سانٹ(Sonnet):

سانیٹ مغربی شاعری میں موسیقیت و غنائیت کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہ صنفِ شاعری مغرب سے اُردو میں آئی ہے۔ یہ دراصل چودہ مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور قافیوں کی خاص ترتیب سے پہچانی جاتی ہے۔ اس میں غزل کی اشاریت اور نظم کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ اُردو ادب میں اس کا آغاز کرنے والوں میں اختر شیرانی، عظمت اللہ اور ن۔م راشد شامل ہیں۔ اس کی درج ذیل تین قسمیں زیادہ تر رائج ہیں۔

الف:	ب:	ج:
ا ______	ا ______	ا ______
ب ______	ب ______	ب ______
ب ______	ب ______	ا ______
ا ______	ا ______	ب ______
ا ______	ا ______	ج ______
ب ______	ب ______	د ______
ب ______	ب ______	ج ______
ا ______	ا ______	د ______
ج ______	ا ______	ہ ______
د ______	ب ______	و ______
ہ ______	ج ______	ہ ______
ج ______	د ______	و ______
د ______	د ______	ز ______
ہ ______	ج ______	ز ______

قسام میں سانٹ کے ہر بند میں قافیوں کی ترتیب مختلف ہے۔

مجید امجدؔ

ولادت: ۱۹۱۴ء　　وفات: ۱۹۷۴ء

عبدالمجید امجدؔ جھنگ، صوبہ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے نانا نور محمد سے حاصل کی ۔ اُنھوں نے بی۔اے تک تعلیم حاصل کی اور پھر راشننگ کے محکمہ سے منسلک ہوگئے اور تمام عمر اسی محکمے میں ملازمت کرتے رہے۔ ۔اس کے علاوہ ایک نیم سرکاری رسالے ''عروج'' کے مدیر بھی رہے۔مجید امجد کی زندگی انتہائی پریشان کن اور تنگی سے بسر ہوئی وہ ساری زندگی مختلف مسائل کا شکار رہے جس کی وجہ سے اُن کی طبیعت میں ایک ٹھہراؤ اور دھیما پن تھا۔مجید امجدؔ کا نام ادبی حلقوں میں نہایت احترام سے لیا جاتا تھا لیکن ملازمت کے سلسلے میں ساہیوال میں زیادہ تر مقیم رہنے اور طبعی درویشی کی وجہ سے اُنھیں عوامی سطح پر زیادہ پذیرائی نہ مل سکی۔زندگی کا زیادہ تر حصہ شہر کے ہنگاموں سے دور کھلے آسمان تلے گزارنے کی وجہ سے اُن کی شاعری کو ایک ارضی بنیاد ملی۔اُن کی شاعری کا پس منظر زمین اور زمین کی محبت ہے۔ اُن کو اصل شہرت اُن کی وفات کے بعد ملی۔

مجید امجدؔ نے کم عمری سے ہی شاعری شروع کی تھی لیکن اُن کی شاعری کا مجموعہ کافی تاخیر سے شائع ہوا۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ چونکہ اُن کی ساری زندگی حزن و یاس اور پریشانی میں بسر ہوئی،اس لیے اُن کی شاعری میں بھی دل گرفتگی کی فضا ملتی ہے۔اُنھوں نے نہ صرف ذاتی کرب کو شاعری کا موضوع بنایا، بلکہ زندگی کو بھی ایک وسیع تناظر میں دیکھتے رہے لہٰذا جب وہ عصری مسائل کو شاعری کا پیکر عطا کرتے ہیں تو وہ انفرادی ہونے کے ساتھ ساتھ اجتماعی رنگ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے ہیت کے تجربے بھی کیے اور اُردو نظم کو نئے انداز اور آہنگ سے روشناس کیا۔

مجموعہ ہائے کلام: شبِ رفتہ ، طاقِ ابد ، ان گنت سورج۔

مجید امجد

نفیرِ عمل

آؤ کب تک گلۂ شومیِ تقدیر کریں
کب تک شیونِ جور فلک پیر کریں
کب تلک ماتم ناکامیِ تدبیر کریں
کب تلک شکوہِ بے مہریِ ایام کریں

نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

آج برباد خزاں ہے چمنستانِ وطن
مرکز نالہ و شیون ہے دبستانِ وطن
آج محروم تجلّی ہے شبستانِ وطن
وقت ہے چارۂ دردِ دلِ ناکام کریں

نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

آؤ اُجڑی ہوئی بستی کو پھر آباد کریں
آؤ کچھ پیروی مسلک فرہاد کریں
آؤ جکڑی ہوئی روحوں کو پھر آزاد کریں
یہ نہیں شرط وفا بیٹھ کے آرام کریں

نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

ایک ہنگامہ سا ہے آج جہاں میں برپا
آج ڈھونڈے سے نہیں ملتی زمانے میں وفا
آج بھائی ہے سگے بھائی کے خوں کا پیاسا
آؤ اس جنس گراں مایہ کو پھر عام کریں

نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

جامِ جم سے نہ ڈریں شوکتِ کَے سے نہ ڈریں
ہم جواں ہیں تو یہاں کی کسی شے سے نہ ڈریں
حشمتِ رُوم اور صولتِ رَے سے نہ ڈریں
ہم جواں ہیں تو نہ کچھ خدشۂ آلام کریں

نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

رشتۂ مکر و ریا توڑ بھی دیں، توڑ بھی دیں
اپنی یہ طُرفہ ادا چھوڑ بھی دیں، چھوڑ بھی دیں
کاسۂ حرص وہوا پھوڑ بھی دیں، پھوڑ بھی دیں
آؤ کچھ کام کریں، کام کریں، کام کریں

نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

(روزِ رفتہ)

مشق

۱۔ نظم ''تفیرِ عمل'' کا مرکزی خیال لکھیں۔

۲۔ اس نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۳۔ درج ذیل مرکبات کے معنی لکھیں:

شومیِ تقدیر ۔ جورِ فلک ۔ محرومِ تجلّی ۔ چارۂ درد

جنسِ گراں مایہ ۔ مکر و ریا

۴۔ نظم ''تفیرِ عمل'' کے پہلے بند میں شاعر نے کن الفاظ میں نوجوانِ وطن کو عمل کا درس دیا ہے؟

۵۔ اس نظم میں استعمال ہونے والے تلمیحات کی نشان دہی کریں۔

۶۔ شاعر کے مطابق نوجوانوں کو کس چیز سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے؟

مخمّس: جس نظم کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہوں اُسے ''مخمّس'' کہتے ہیں۔

معریٰ نظم: معریٰ نظم میں قافیہ اور ردیف کی پابندی نہیں ہوتی مگر وزن اور بحر کی پابندی لازمی ہے۔

منؔیر نیازی

ولادت: ۱۹۲۸ء | وفات: ۲۰۰۶ء

منؔیر احمد خان نیازی ضلع ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) کے ایک گاؤں خان پور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم خان پور ہی میں حاصل کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُن کا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آیا اور ساہیوال میں رہائش اختیار کی۔ بہاولپور سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد منیر نیازی نے دیال سنگھ کالج لاہور سے بی۔ اے کیا۔ انھوں نے ''سات رنگ'' کے نام سے ایک ہفتہ وار رسالہ جاری کیا۔ اس کے علاوہ وہ مختلف اخبارات، رسائل اور ریڈیو پاکستان سے بھی منسلک رہے جبکہ فلموں کے لیے بھی شاعری کرتے رہے۔

منؔیر نیازی کی شناخت کے لیے ایک ہی لفظ کافی ہے اور وہ ہے ''تحیّر'' وہ تحیّر کے شاعر ہیں۔ وہ نامعلوم کیفیات کا سراغ لگانا چاہتے ہیں اور جانی پہچانی اشیا کو اپنی شاعرانہ حسیات سے ایک نیا رُخ دیتے ہیں۔ منؔیر کی شاعری محض خلا میں پروان نہیں چڑھی بلکہ اپنے عہد کی ترجمانی کرتی ہے جو نئے رموز اور علامات کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اُن کی شاعری میں والہانہ سرشاری کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے ڈھنگ کے ایک الگ شاعر ہیں جو گھسی پٹی راہوں سے دُور کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کا لہجہ عام اسلوب سے اتنا مختلف ہے کہ اُن کی شناخت آسانی سے ہوسکتی ہے۔ اُن کی ادبی خدمات کے صلے میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے اُنھیں ''کمالِ فن'' اور ''ستارۂ امتیاز'' سے بھی نوازا گیا ہے۔

مجموعہ ہائے کلام: تیز ہوا اور تنہا پھول، جنگل میں دھنک، دشمنوں کے درمیان شام، چھے رنگین دروازے۔ وغیرہ

منیؔر نیازی

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں ہر کام کرنے میں
ضروری بات کرنی ہو، کوئی وعدہ نبھانا ہو
اُسے آواز دینی ہو، اسے واپس بلانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں
مدد کرنی ہو اس کی، یار کی ڈھارس بندھانا ہو
بہت دیرینہ رستوں پر کسی سے ملنے جانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں
بدلتے موسموں کی سیر میں دل کو لگانا ہو
کسی کو یاد رکھنا ہو کسی کو بھول جانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں
کسی کو موت سے پہلے کسی غم سے بچانا ہو
حقیقت اور تھی کچھ اس کو جا کر یہ بتانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں

(ساعتِ سیار)

مشق

۱۔ اس نظم میں انسان کی کس نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟
۲۔ ان کاموں کی تفصیل بیان کریں جن کے کرنے میں شاعر سے دیر ہو جاتی ہے؟
۳۔ عام زندگی میں دیر کرنے کے کیا نقصانات متوقع ہوتے ہیں؟
۴۔ درج ذیل مصرعوں کی وضاحت کریں۔
الف۔ مدد کرنی ہو اس کی، یار کی ڈھارس بندھانا ہو
ب۔ حقیقت اور تھی کچھ، اس کو جا کر یہ بتانا ہو
ج۔ اُسے آواز دینی ہو، اُسے واپس بلانا ہو
۵۔ ایسے پانچ الفاظ لکھیں جن کے دو دو معنی ہوں۔
۶۔ اس نظم کا خلاصہ تحریر کریں۔
۷۔ درج ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

دیرینہ ۔ ڈھارس بندھانا ۔ حقیقت ۔ دل لگانا۔ وعدہ نبھانا۔

وزیر آغا

بڑے ڈرپوک ہو!

بڑے ڈرپوک ہو تارو!
فقط شب کو نکلتے ہو!!

کبھی آنسو کی بھیگی مامتا میں
مہکتی چاندنی کی
اوڑھنی میں.......... چھپ کے آتے ہو
کبھی تم
روشنی کی ان گنت میخوں کی صورت
تیرگی کے جسم میں پیوست ہوتے ہو
نہ جیتے ہو نہ مرتے ہو

بڑے ڈرپوک ہو تارو!
کبھی دیکھا نہیں تم نے کہ دن
کتنا منوّر
کس قدر بے انت ہوتا ہے
کبھی دیکھا نہیں تم نے
وہ تارا

جو فقط دن کو نکلتا ہے
چمکتی برچھیوں سے لیس ہو کر
اک سنہرا گُرز اپنے ہاتھ میں لے کر
بہادر.............. سُورما
تنہا گزرتا ہے
اُفق کی قوس سے
غم کی، خوشی کی، سرحدوں سے
بے خطر بڑھتا چلا جاتا ہے
آخر شام کے کہرام میں
منزل پہ اپنی جا پہنچتا ہے *
بڑے ڈرپوک ہو تارو!
فقط شب کو نکلتے ہو!!

(اوراق۔ اگست، ستمبر ۱۹۹۵ء)

*نصابی ضرورتوں کے تحت قدرے ترمیم کے بعد

مشق

ا۔ نظم کے مطابق درج ذیل سوالوں کا جواب لکھیں۔

ا۔ اس نظم میں شاعر ستاروں سے کیا کہہ رہا ہے؟

ب۔ شاعر نے نظم میں بہادر اور سورما کس کو کہا ہے؟

ج۔ شاعر نے ستاروں کو ڈرپوک کیوں کہا ہے؟

د۔ آزاد نظم اور معریٰ نظم کی تعریف کریں اور ایک ایک مثال دیں۔

ہ۔ دن کو نکلنے والے ستارے کی کون کون سی خوبیاں بیان کی گئی ہے؟

آزاد نظم:

اُردو شاعری میں جب موضوعات اور خیالات کی بھرمار ہوگئی تو شاعروں کو قافیہ اور ردیف کی پابندی سے اُلجھن ہونے لگی۔ مغربی ادب کے زیرِ اثر یہاں بھی جدید نظم کا رواج ہوا۔ ان میں آزاد نظم اور نظمِ معریٰ قابلِ ذکر ہیں۔ آزاد نظم میں قافیہ اور ردیف سمیت وزن اور بحر کی پابندی نہیں ہوتی تاہم اشعار میں تسلسل، روانی اور موسیقیت ضروری ہے۔ آزاد نظم کی بنیاد ایک بحر پر ہوتی ہے لیکن اس بحر کے ارکان کی تقسیم شاعر کی صوابدید پر ہوتی ہے۔ کوئی مصرع بڑا اور کوئی چھوٹا ہوتا ہے اور بعض اوقات تو ایک مصرع بہت طویل ہوتا ہے۔ آزاد نظم میں ہیئت کے حوالے سے متعدد تجربات ہوئے ہیں۔ آزاد نظم میں شعری آہنگ اور صوتی تاثر کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

حِصّہ غزل

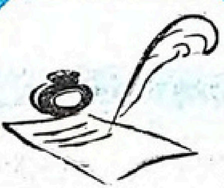

علامہ اقبال

غزل

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جُدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

مجھے روکے گا تُو اے ناخُدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس اُن کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دِل کے سینوں میں

نہ پُوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

محبت کے لیے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی اُن کو جمال اپنا
بہت مدّت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں

خموش اے دِل بھری محفل میں چلّانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

بُرا سمجھوں اُنھیں، مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں تو خود بھی ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

(بانگِ درا)

مشق

ا۔ غزل کے مطابق درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

ا۔ شاعر زمین و آسمان میں کیا ڈھونڈتا ہے؟
ب۔ وصل کا وقت جلد کیوں بیت جاتا ہے؟
ج۔ اہلِ دل سے کون سے لوگ مراد ہیں؟
د۔ محبت کا اولین درس کون سا ہے؟
ہ۔ خود پر نکتہ چینی کا کیا مطلب ہے؟
و۔ یدِ بیضا کی وضاحت کریں۔

۲۔ اس غزل کے قوافی لکھیں۔

۳۔ ؎ مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جُدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

اس شعر میں صنعتِ تضاد پائی جاتی ہے۔ صنعتِ تضاد کی تعریف کریں، مزید مثالیں دیں اس شعر میں میں اس کی نشان دہی کریں۔

۴۔ درج ذیل الفاظ کے معنی لکھیں

نکتہ چیں، یدِ بیضا، باریک بین، موجِ نفس، محمل نشیں، ارادت۔

۵۔ ؎ جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

کلام میں ایسے الفاظ جو املا کے لحاظ سے تو ایک جیسے ہوں مگر دونوں کا مطلب جدا ہو۔ تجنیس تام کہلاتا ہے۔ اوپر دیے گئے شعر میں تجنیس تام کی نشان دہی کریں اور کوئی سے دو ایسے اشعار لکھیں جن میں صنعتِ تجنیس تام کا استعمال ہو۔

غزل: غزل کا لفظ عربی زبان کا ایک مصدر ہے۔ جس کے معنی ''کاتنا'' (چرخے پر روئی سے سُوت ''دھاگہ'' بنانا) ہے۔
ادب کی رُو سے غزل کے معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا، عورتوں کے حُسن جمال کی تعریف کرنا۔
غزل نظم کی ایسی صنف ہے جس میں عشق و محبت (حقیقی و مجازی) کا ذکر ہوتا ہے۔
غزل کے کم از کم اشعار کی تعداد پانچ اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

فیض احمد فیضؔ

ولادت: ۱۹۱۰ء وفات: ۱۹۸۴ء

فیض احمد فیضؔ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی بی۔اے کرنے کے بعد عربی میں بی۔اے آنرز کیا اور پھر انگریزی اور عربی میں ایم۔اے کیا۔ فیض کی عملی زندگی بڑی متنوع اور ہنگامہ خیز تھی۔ کچھ عرصے فوج میں بھی ملازمت کی۔ راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے اور سب کو یقین تھا کہ اُنھیں پھانسی کی سزا ہو جائے گی لیکن انھیں ڈھائی سال قید کی سزا ملی۔ فیض کا پہلا مجموعہ کلام ''نقشِ فریادی'' کے نام سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ اپنی شاعری اور انسان دوست خیالات کی وجہ سے انھیں لینن امن ایوارڈ بھی ملا۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء میں فیض احمد فیضؔ کا مقام بہت بلند اور منفرد ہے۔ فیضؔ کو پیکر تراشی میں ایک خاص ملکہ تھا۔ لفظی تصویر کشی میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ سراسر جمالیات کے شاعر ہیں۔ انھوں نے نغمگی، امیجری، استعارہ اور تشبیہ جیسے فنی لوازمات کو بڑی ہنرمندی سے استعمال کیا۔ فیضؔ اردو شاعری کی روایات سے بخوبی آگاہ تھے اور فارسی، انگریزی شاعری سے بھی واقف تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز رومان اور وجدان سے ہوتا ہے لیکن زندگی کے سخت اور کڑے حقائق جلد ہی ان کی شاعری کی مستقل راہ متعین کر دیتے ہیں۔ ذاتی دکھ کے علاوہ عالم انسانیت کے رنج والم اپنے اندر محسوس کرتے ہیں اور یوں ان کی شاعری محبت اور حقیقت کا حسین امتزاج بن جاتی ہے۔

مجموعہ ہائے کلام: نقشِ فریادی، دستِ صبا، زندان نامہ، دست تہِ سنگ، سرِ وادیٔ سینا، شامِ شہرِ یاراں میرے دل مرے مسافر۔ غبارِ ایام۔

غزل

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں جاں بیچ آئیں
دل والو! کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں؟

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

(زندان نامہ)

مشق

۱۔ اس غزل کے قوافی لکھیں۔
۲۔ کوچۂ جاناں، میدانِ وفا، نام ونسب، کون سے مرکبات ہیں۔
۳۔ اس غزل میں سے حروفِ عطف، حروفِ اضافی اور حروفِ جار تلاش کر کے لکھیں۔
۴۔ اس غزل کے کس شعر میں صنعتِ تضاد موجود ہے؟
۵۔ غزل کے مطابق درج ذیل سوالوں کے جواب لکھیں:
ا۔ پہلے شعر میں کس بات پر شکر کا اظہار کیا گیا ہے؟
ب۔ دل بیچنے سے کیا مراد ہے؟
ج۔ تیسرے شعر کے مطابق کس انداز کو دوام حاصل ہے؟
د۔ میدانِ وفا اور عام زندگی میں کون سی چیز مشترک نہیں ہے
ہ۔ عشق میں جیت اور ہار کو ایک جیسا مقام کیوں دیا جاتا ہے؟

شعر: وہ کلامِ موزوں جو بامقصد ہو، ایک خیال کو ظاہر کرے اور جس کے دونوں مصرعے ایک ہی وزن میں ہوں "شعر" کہلاتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی

غزل

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مرجاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

تیرا در چھوڑ کے میں اور کدھر جاؤں گا
گھر میں گھِر جاؤں گا صحرا میں بکھر جاؤں گا

تیرے پہلو سے جو اُٹھوں گا تو مشکل یہ ہے
صرف اک شخص کو پاؤں گا جدھر جاؤں گا

اب ترے شہر میں آؤں گا مسافر کی طرح
سایۂ ابر کی مانند میں گزر جاؤں گا

تیرا پیمانِ وفا راہ کی دیوار بنا
ورنہ سوچا تھا کہ جب چاہوں گا مرجاؤں گا

چارہ سازوں سے الگ ہے میرا معیار کہ میں
زخم کھاؤں گا تو کچھ اور سنور جاؤں گا

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیمؔ
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

(بسیط، دسمبر ۱۹۸۹ء)

مشق

۱۔ اس غزل کا مطلع اور مقطع لکھ کر ان کی تشریح کریں۔

۲۔ اس غزل کے قوافی لکھیں۔

۳۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگائیں۔
سمندر، صحرا، معیار، شمع، صبح۔

۴۔ شعر کی تشریح کریں۔
زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیمؔ
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

۵۔ تیرا در چھوڑ کے میں اور کدھر جاؤں گا
گھر میں گھِر جاؤں گا صحرا میں بکھر جاؤں گا

دو الفاظ جو تحریر میں بالکل یکساں ہوں لیکن اعراب میں فرق ہو، تجنیس محرف کہلاتے ہیں۔ درج بالا شعر میں لفظ ''گھر'' تجنیس محرف ہے۔ جو دو بار الگ الگ معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ دو ایسے اشعار لکھیں جن میں تجنیس محرف موجود ہو۔

۶۔ غزل کے آخری شعر میں تشبیہ استعمال ہوئی ہے۔ اس کے ارکانِ تشبیہ بیان کریں۔

۷۔ غزل کے مطابق درج ذیل سوالوں کے جواب لکھیں:

ا۔ شاعر نے اپنے لیے کون سا استعارہ استعمال کیا ہے؟

ب۔ صحرا میں بکھرنے سے کیا مراد ہے؟

ج۔ تیسرے شعر میں شخص کا لفظ کس کے لیے استعمال ہوا ہے؟

د۔ شاعر کی موت میں کون سی چیز حائل ہے؟

ہ۔ زخم کھا کر سنورنے سے کیا مراد ہے؟

ناصر کاظمی

ولادت: ۱۹۲۵ء

وفات: ۱۹۷۲ء

ناصر کاظمی انبالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد سلطان کاظمی انڈین آرمی میں ملازم تھے اور اُن کی تعیناتی مختلف مقامات پر رہی۔ اس لیے ناصر کاظمی نے مختلف شہروں میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کی تکمیل پر وہ واپس انبالہ چلے گئے اور زمینوں کی دیکھ بھال شروع کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ لاہور چلے آئے اور مختلف صحافتی اداروں سے منسلک رہے۔ وہ ماہنامہ "ہمایوں" کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔ کچھ عرصہ ریڈیو پاکستان لاہور میں بھی ملازمت کی۔ ناصر کاظمی کا انتقال لاہور میں ہوا۔

ناصر کی غزلوں میں قدیم رنگ اور جدید رومانی رویوں کا امتزاج ملتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے عروج میں جب نظم زوروں پر تھی، ناصر نے غزل کی ساکھ کو قائم رکھا۔ ان کی غزل میں میر کے طرزِ ادا کے ساتھ ساتھ ان کا طرزِ احساس بھی ملتا ہے۔ پاکستان کا قیام ایک طرف تو مسلمانوں کے لیے ایک عظیم واقعہ ہے لیکن دوسری طرف بدترین فسادات، قتل و غارت گری، دہشت گردی اور اپنی مٹی سے ہجرت، اس کے الم ناک پہلو بھی ہیں۔ ان حالات نے اوروں کی طرح ناصر کاظمی کے دل و دماغ پر بھی برے اثرات مرتب کیے۔ ان کی غزلوں میں اعلیٰ اقدار کی شکست کا ماتم ہے۔ حُزن و یاس، محرومی اور ناکامی کے احساس کے ساتھ معاشرے کی منفی قدروں پر طنز اور تلخی کا اظہار ان کی غزل میں نمایاں ہے۔ ناصر کی شاعری میں سادگی اور دلکشی ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں اور سادہ الفاظ میں وہ اپنے جذبوں کا اظہار کرتے ہیں۔

مجموعہ ہائے کلام: برگِ نے۔ خشک چشمے کے کنارے۔ دیوان۔ پہلی بارش۔ نشاطِ خواب۔ سُر کی چھایا۔

غزل

سفرِ منزلِ شب یاد نہیں
لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں

اوّلیں قُرب کی سرشاری میں
کتنے ارماں تھے جو اب یاد نہیں

دل میں ہر وقت چبھن رہتی تھی
تھی مجھے کس کی طلب یاد نہیں

وہ ستارا تھی کہ شبنم تھی کہ پھول
ایک صورت تھی عجب یاد نہیں

کیسی ویراں ہے گزرگاہِ خیال
جب سے وہ عارض و لب یاد نہیں

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار
یاد آئیں بھی تو اب یاد نہیں

رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اُس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

یہ حقیقت ہے کہ احباب کو ہم
یاد ہی کب تھے کہ اب یاد نہیں

یاد ہے سیرِ چراغاں ناصر
دل کے بجھنے کا سبب، یاد نہیں

(برگِ نے)

مشق

۱۔ اس غزل کے قوافی اور ردیف لکھیں۔

۲۔ قواعد کی رُو سے درج ذیل مرکبات کے نام لکھیں۔
عارض و لب، گزرگاہِ خیال، رشتۂ جان۔

۳۔ شاعر کے دل میں ہر وقت چبھن کیوں رہتی ہے؟

۴۔ شاعر نے احباب سے کیا گلہ کیا ہے؟

۵۔ ناصر نے دل کے بجھنے کی وجہ کیوں نہیں بتائی؟

شکیبؔ جلالی

ولادت: ۱۹۳۴ء

وفات: ۱۹۶۶ء

سید حسن رضوی شکیبؔ جلالی قصبہ جلالی، ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم بدایوں میں حاصل کی۔ شکیبؔ جلالی کی معاشی حالت شروع سے ہی خراب تھی۔ والد کی بیماری کے باعث سارے گھر کی ذمہ داری اُن پر آن پڑی۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ پاکستان چلے آئے اور لاہور سے بی۔اے کیا۔ ابتدا میں رسائل کے دفاتر میں ملازمت کی پھر محکمہ تعلیم میں ملازم ہوگئے۔ ان کی تمام زندگی کرب و ملال اور تلخیوں میں گزری۔ وہ اکثر بیمار رہا کرتے تھے اور آخر میں کئی ذہنی و نفسیاتی امراض کا شکار ہوگئے تھے۔ وہ صرف ۳۲ برس کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

شکیبؔ جلالی کا مجموعۂ کلام "روشنی اے روشنی" بہت جلد مقبول ہوا اور اس کے اکثر اشعار زبان زد خاص و عام ہوگئے۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز اس وقت کیا جب اردو غزل نئے امکانات اور تجربات سے گزر رہی تھی۔ ذہنی اور فکری رویّوں میں تبدیلی آرہی تھی۔ اُس دور میں ایسے شعرا قابلِ قدر جانے جاتے تھے جن کے ہاں عصری شعور کے ساتھ ساتھ تجربات اور مشاہدات میں بھی جدّت نظر آئے۔ جدید رجحانات کے باعث شکیبؔ جلالی بہت جلد ممتاز ہوگئے۔ وہ آسان زبان کے شاعر سمجھے جاتے ہیں لیکن ان آسان الفاظ میں بھی معنوی تہہ داری موجود ہے۔ شکیبؔ جلالی نے چند ایک نظمیں بھی کہی ہیں لیکن اُن کی اصل مہارت غزل کے میدان میں ہے۔

مجموعۂ کلام: روشنی اے روشنی۔

NOT FOR SALE

غزل

آکے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اُس پیڑ کے پھل تھے، پسِ دیوار گرے

مجھے گرنا ہے تو میں، اپنے ہی قدموں میں گروں
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

تیرگی چھوڑ گئے دل میں، اُجالے کے خطوط
یہ ستارے مرے گھر ٹوٹ کے، بے کار گرے

دیکھ کر اپنے در و بام، لرز جاتا ہوں
مرے ہمسائے میں جب بھی کوئی دیوار گرے

وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے
کس گھڑی سر پہ یہ لٹکی ہوئی تلوار گرے

دیکھتے کیوں ہو شکیبؔ اتنی بلندی کی طرف
نہ اُٹھایا کرو سر کو کہ یہ دستار گرے

(روشنی اے روشنی)

NOT FOR SALE

مشق

۱۔ کلام میں اعداد کا ذکر کرنا، خواہ ترتیب سے ہوں یا بے ترتیب ہوں ، صفت الاعداد کہلاتا ہے۔ جیسے:

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے

سیاقۃ الاعداد کی مزید تین مثالیں لکھیں۔

۲۔ درج ذیل الفاظ کے مترادف لکھیں۔

پیڑ، تیرگی، ہمسایہ، بلندی، اُجالا۔

۳۔ اس غزل کے اُس شعر کی نشان دہی کریں، جس میں صنعتِ تضاد کا استعمال ہے۔

۴۔ دی گئی غزل کے مطابق درج ذیل سوالوں کے جواب لکھیں:

ا۔ ''صحن میں پتھر گرنے'' سے کیا مراد ہے؟

ب۔ شاعر کے دل میں کون تیرگی چھوڑ گئے؟

ج۔ شاعر کیوں لرز جاتا ہے؟

د۔ وقت کی ڈور ٹوٹنے سے کیا مراد ہے؟

ہ۔ شاعر نے بلندی کی طرف دیکھنے سے کیوں منع ہے ؟

احمد فراز

ولادت: ۱۹۳۳ء وفات: ۲۰۰۸ء

سید احمد شاہ احمد فرازؔ کوہاٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید محمد شاہ برقؔ تھا جو خود بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ اس لحاظ سے فراز نے ایک ادبی ماحول میں آنکھ کھولی۔ احمد فرازؔ نے ایڈورڈز کالج پشاور سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا اور پھر پشاور یونیورسٹی سے اردو اور فارسی میں ایم۔اے کیا اور کچھ عرصے اسی یونیورسٹی میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ اس کے علاوہ اکادمی ادبیات کے ڈائریکٹر اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے سربراہ بھی رہے۔ احمد فرازؔ آزادیٔ اظہار کے قائل تھے، اسی وجہ سے انھیں فوجی حکومتوں میں شدید تکالیف کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن اُنھوں نے کبھی اپنے اُصولوں پر سمجھوتہ نہ کیا۔ یہاں تک کہ ۲۰۰۴ء میں ملنے والا اعزاز ''ہلالِ امتیاز'' انھوں نے اس بنا پر واپس کردیا کہ حکومت انسانی حقوق کی کھُلم کھُلا خلاف ورزی کر رہی تھی۔ اسی طرح کوہاٹ میں موجود پبلک لائبریری کو پلازے میں تبدیل کرنے پر وہ اس قدر دِل برداشتہ تھے کہ اُنھوں نے وصیت کی کہ مجھے مرنے کے بعد کوہاٹ میں دفن نہ کیا جائے۔

احمد فرازؔ کی شاعری کو جتنا قبولِ عام حاصل ہُوا، شاید ہی کسی اور کو حاصل ہوا ہوگا۔ سہلِ ممتنع میں شعر کہنا اور پھر اُسے عوام و خواص کے ذہن میں مرتسم کرنا احمد فراز کے لیے بے حد آسان کام تھا۔ ان کے کلام میں شگفتگی کے ساتھ ساتھ قدرے تفکر بھی پایا جاتا ہے۔ سماجی ناانصافیوں پر احتجاج تقریباً ہر شاعر کا موضوع رہا ہے لیکن احمد فراز کے ہاں یہ رنگ سب سے جدا ہے۔ ان کی شاعری کے تیرہ مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔

مجموعہ ہائے کلام: تنہا تنہا، دردِ آشوب، نایافت، شب خون، میرے خواب ریزہ ریزہ، جاناں جاناں، بے آواز گلی کوچوں میں، نابینا شہر میں آئینہ، سب آوازیں میری ہیں، پسِ انداز موسم، خوابِ گل پریشاں ہے، غزل بہانہ کروں، اے عشقِ جنوں پیشہ۔

احمد فرازؔ

غزل

لب کشا لوگ ہیں ، سرکار کو کیا بولنا ہے
اب لہو بولے گا تلوار کو کیا بولنا ہے

بکنے والوں میں جہاں ، ایک سے ایک آگے ہو
ایسے میلے میں ، خریدار کو کیا بولنا ہے

لو چلے آئے عدالت میں گواہی دینے
مجھ کو معلوم ہے ، کس یار نے، کیا بولنا ہے

اور کچھ دیر رہے گوش بر آواز ہَوا
پھر چراغِ سرِ دیوار کو کیا بولنا ہے

مجھ سے کیا پوچھتے ہو ، آخری خواہش میری
اِک گنہگارِ سرِ دار ، کو کیا بولنا ہے

خلقتِ شہر تھی چُپ ، شاہ کے فرمان کے بعد
اب کسی واقفِ اَسرار کو کیا بولنا ہے

وہی جانے پسِ پردہ ، جو تماشا گر ہے
کب، کہاں، کون سے کردار کو کیا بولنا ہے

جہاں دربار ہوں شاہوں کے ، مصاحب ہوں فرازؔ
وہاں غالب کے ، طرف دار کو کیا بولنا ہے

(اے عشقِ جنوں پیشہ)

مشق

۱۔ دی گئی غزل کے مطابق درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں:
ا۔ ''اَب لہو بولے گا'' سے کیا مراد ہے؟
ب۔ ہوا کے گوش برآواز سے کیا مراد لی گئی ہے؟
ج۔ خلقت شہر کیوں چپ تھی؟
د۔ شاعر نے آخری خواہش کیوں نہ بتائی؟

۲۔ اس غزل کی ردیف لکھیں۔

۳ اس غزل کے قوافی لکھیں۔

۴۔ ؎ بکنے والوں میں جہاں ایک سے ایک آگے ہو
ایسے میلے میں خریدار کو کیا بولنا ہے

کلام میں کسی چیز کا ذکر کرنا اور پھر اُس کی مناسبت سے دوسری چیزیں لانا بشرطیکہ یہ چیزیں متضاد نہ ہوں مراعاۃ النظیر کہلاتا ہے۔جیسے مندرجہ بالا شعر میں بکنے کی مناسبت سے میلے اور خریدار کا ذکر کیا گیا ہے۔کم از کم تین ایسے اشعار لکھیں جن میں صنعتِ مراعاۃ النظیر کا استعمال ہو۔

۵۔ درج ذیل شعر کی تشریح کریں:

؎ جہاں دربار ہوں شاہوں کے مصاحب ہوں فرازؔ
وہاں غالبؔ کے طرف دار کو کیا بولنا ہے

ظفر اقبال

ولادت: ۱۹۳۳ء

اوکاڑہ میں پیدا ہونے والے ظفر اقبال کی شاعری کا سفر نصف صدی سے زیادہ ہے۔ ابتدا میں وہ غزل کی روایات کے کبھی قریب اور کبھی دُور ہوئے۔ آخر کار غزل کی روایات کے سحر سے آزاد ہوگئے لیکن اس سفر میں اُنھیں کڑے مراحل سے گزرنا پڑا، اُردو ادب کا عام قاری اور تخلیق نگار اُردو غزل کی روایات کا ایسا اسیر ہے کہ وہ اس طلسمی فضا سے باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ گزشتہ صدیوں میں حالی اور انشاء نے غزل کی روایات کو توڑنے کی کوشش ضرور کی لیکن اس کوششوں کی بنا پر غزل میں کیا تبدیلی آتی، اُردو غزل میں حالی اور انشا اپنے مقام سے محروم ہوگئے۔

ظفر اقبال کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے غزل کی صدیوں پُرانی روائتی فضا اور غزل کی موروثی جمالیات کو مکمل طور پر تبدیل کردیا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اُنھیں بجا طور پر بیسویں صدی کا ادبی مرتد اور روایتی غزل کی غلامی سے آزاد ہونے والا پہلا شاعر کہا ہے۔

مجموعہ ہائے کلام: تجدید، تقویم، تشکیل، تجاوز، توارد، تساہل، آبِ رواں، گلافتاب، ہٹے ہنومان، رطب و یاس، اب تک (کلیات)

غزل

مل کے بیٹھے نہیں، خوابوں میں شراکت نہیں کی
اور کیا رشتہ ہو تجھ سے جو محبت نہیں کی

یہیں پھرتے ہیں شریف آدمیوں کی صورت
دشت میں خاک اُڑائی نہیں، وحشت نہیں کی

خاص ہم سے تو کوئی تھا ہی نہیں تیرا سلوک
اور، ہم نے بھی ترے ساتھ رعایت نہیں کی

پوچھ لیتے کبھی تیرا بھی ارادہ تجھ سے
ہم نے چاہا تو کئی بار تھا، ہمت نہیں کی

بہت اچھا بھی لگا تُو، ہمیں اُس محفل میں
ہم نے دانستہ وہاں تیری حمایت نہیں کی

ظرف اتنا بھی کُشادہ نہیں اپنا، لیکن
ہم نے، پیدا بھی ہوئی ہے تو شکایت نہیں کی

یہ بھی سچ ہے کہ ترے ہم بھی سوالی نہ ہوئے
اور ، تُو نے بھی کبھی کوئی عنایت نہیں کی

ہو رہا ہے جو ، اسی طرح سے ہونا تھا یہاں
اس لیے ہم نے کسی بات پہ حیرت نہیں کی

جو میسر ہُوا ، تھا وہ بھی زیادہ، کہ ظفرؔ
جو ملا ہی نہیں، اس کی کبھی حسرت نہیں کی

(تشکیل)

مشق

۱۔ اس غزل کے مطلع اور مقطع کی تشریح کریں۔
۲۔ اس غزل کے کس شعر میں صنعتِ مراعاۃ النظیر کا استعمال کیا گیا ہے؟
۳ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگائیں۔
شراکت، دشت، سلوک، میسر،
۴۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کریں۔

ظرف اتنا بھی کشادہ نہیں اپنا، لیکن
ہم نے پیدا بھی ہوئی ہے تو شکایت نہیں کی
ہو رہا ہے جو، اسی طرح سے ہونا تھا یہاں
اس لیے ہم نے کسی بات پہ حیرت نہیں کی

۵۔ دی گئی غزل کے مطابق درست جملے کے سامنے (✓) کا نشان اور غلط کے سامنے (X) کا نشان لگائیں۔

ا۔ شاعر محبوب کے خوابوں میں حصے دار نہیں ہوتا۔
ب۔ محبوب کی جفاؤں سے شاعر وحشت زدہ ہوگیا۔
ج۔ شاعر نے بے وفائی کا بدلہ لیا۔
د۔ شاعر نے جان بوجھ کر محبوب کا ساتھ نہیں دیا۔
ہ۔ سوال کرنا شاعر کو اچھا نہیں لگتا۔
و۔ شاعر کو محبوب کے رویے پر بے حد حیرت ہے۔
ز۔ شاعر کا ظرف بے پناہ وسیع ہے۔
ح۔ شاعر اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے سوال نہیں کرتا۔
ط۔ ''وصالِ یار'' شاعر کی حسرت ہے۔
ی۔ چاہت کے باوجود شاعر ہمت نہ کرسکا۔

شہزاد احمد

ولادت: ۱۹۳۲ء | وفات: ۲۰۱۲ء

شہزاد احمد امرتسر میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام حافظ محمد بشیر تھا جنھوں نے طب کے موضوع پر اُردو میں کئی کتابیں تحریر کیں ۔ شہزاد احمد نے میٹرک کا امتحان امرتسر سے پاس کیا ۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُن کا خاندان لاہور منتقل ہوا۔ اُنھوں نے ایم ۔اے ۔او کالج لاہور سے بی۔اے کیا اور اس کے بعد فلسفہ اور نفسیات میں ایم۔اے کیا۔

حصولِ رزق کے لیے اُنھوں نے مختلف ملازمتیں کیں۔ وہ مختلف رسائل میں لکھتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ محمود شام کے ساتھ مل کر ایک رسالے ''معیار'' کا بھی اجرا کیا۔ اُنھیں ۱۹۹۷ء میں صدارتی ایوارڈ برائے حسنِ کارکردگی عطا کیا گیا۔

اُردو کے جدید شعرا میں ایک اہم نام شہزاد احمد ہے جنھوں نے زندگی کے بدلتے ہوئے حالات اور جدید تقاضوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ وہ جذباتی سطح پر متوازن، فکری سطح پر متحرک اور تحقیقی سطح پر فعال ہیں۔ اسلوب کی تازہ کاری سے اُنھوں نے غزل کو نئی جہت سے آشنا کیا۔

اُن کا تخلیقی عمل صرف اپنی ذات کے گرد نہیں گھومتا، بلکہ انھوں نے انسانی مسائل اور عالمگیر حقائق کی روشنی میں اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے ہاں انسانی فطرت کی پیچیدگیوں کے ساتھ حالات و واقعات کا خارجی و داخلی آہنگ ہے۔ اُنھوں نے علم ، مطالعہ اور احساس و تخیل سے انسانی فطرت کو

جاننے کی کوشش کی ہے۔اُن کی غزل اُن کے ہاں لوگوں کا نوحہ ہے، جن میں منافقت رچی بسی ہے اور احساسِ زیاں سے عاری ہیں۔کبھی کبھی سائنسی، نفسیاتی اور فلسفیانہ افکار کی کثرت سے غزل کی روایات مجروح ہوتی نظر آتی ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی اُنھوں نے غزل کی روایات کی پاسداری کی ہے۔ڈاکٹر انور سدید نے اُنھیں نئی غزل کا مزاج دان کہا ہے۔

تصانیف/مجموعہ ہائے کلام

صدف ، جلتی بجھتی آنکھیں ، ادھ کھلا دریچہ ، خالی آسمان ، بچھڑ جانے کی رُت، دیوار پہ دستک، ٹوٹا ہوا پل، کون اُسے جاتا دیکھے، پیشانی میں سورج، اُترے میری خاک پہ ستارہ۔ اسلامی فکر کی نئی تشکیل

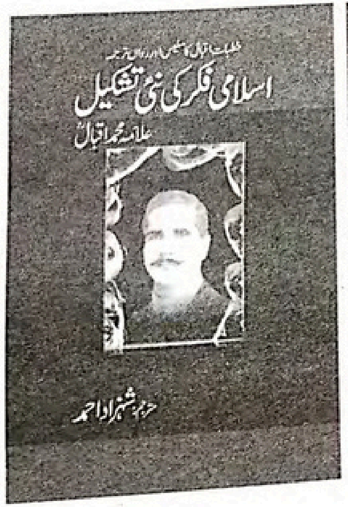

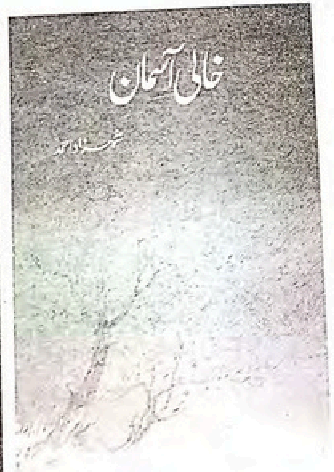

شہزاد احمد

غزل

نہ سہی کچھ مگر اتنا تو کیا کرتے تھے
وہ مجھے دیکھ کے پہچان لیا کرتے تھے

آخر کار ہوئے تیری رضا کے پابند
ہم کہ ہر بات پہ اصرار کیا کرتے تھے

خاک ہیں اب تری گلیوں کی وہ عزت والے
جو ترے شہر کا پانی نہ پیا کرتے تھے

اب تو انسان کی عظمت بھی کوئی چیز نہیں
لوگ پتھر کو خدا مان لیا کرتے تھے

دوستو! اب مجھے گردن زدنی کہتے ہو
تم وہی ہو کہ مرے زخم سیا کرتے تھے

اب تو شہزاد ستاروں پہ لگی ہیں نظریں
کبھی ہم لوگ بھی مٹی میں جیا کرتے تھے

مشق

۱۔ غزل کے مطابق درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

ا۔ شاعر نے اصرار کرنا کیوں چھوڑ دیا؟
ب۔ گلیوں کی خاک ہونے سے کیا مراد ہے؟
ج۔ زخم سینے سے کیا مراد لی گئی ہے؟
د۔ کسی کے شہر کا پانی تک نہ پینا، کس بات کی غمازی کرتا ہے؟
ہ۔ شاعر نے ستاروں پر نظریں کیوں لگائی ہیں؟

۲۔ اس غزل کی ردیف لکھیں۔

۳۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگائیں۔

گردن زدنی، رضا، اصرار، شہر، عظمت۔

۳۔ درج ذیل شعر کی تشریح کریں۔

آخر کار ہوئے تیری رضا کے پابند
ہم کہ ہر بات پہ اصرار کیا کرتے تھے

فرہنگ

مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم

الفاظ	معانی
اسماءالرجال	علمِ حدیث کا ایک شعبہ جس میں راویانِ حدیث کے نام اور حالات پر بحث کی جاتی ہے۔
تالیف	مختلف کتابوں کے مضامین کا انتخاب کر کے نئی کتاب ترتیب دینا
تصفیہ	فیصلہ، صلح
ذہبی	مشہور عرب محدث اور مورّخ
رصدخانہ	وہ بلند مقام جہاں سے سیاروں کی گردش کا مشاہدہ کیا جاتا ہے
سررشتہ	محکمہ
صنائع	(صنعت کی جمع)
طبقات	طبقہ کی جمع
طیلسان	پگڑی یا چادر، دھاری دار چادر
فقہ	قانونِ شریعت کے مسائل کا علم

الفاظ	معانی
فہم	سمجھ
مقری	مراکش سے تعلق، مشہور ادیب، تاریخ دان اور عالمِ دین
مُناظرہ	ایسی بحث جو کسی قاعدے کے تحت کی جائے
مواضع	(موضع کی جمع) گاؤں، علاقہ
موشگافی	بات سے بات نکالنا، بال کی کھال اُتارنا
نحو	کلموں یا جملوں کے اجزاء کو درست جوڑنے کا علم
نیشاپور	شمال مشرقی ایران کا شہر، ایک زمانے میں علم و فن کا مرکز تھا۔

سقراط

اکتسابِ علم	علم کا حصول
انحراف	دور ہٹنا، چھوڑنا
جمادات	بے جان چیزیں
رایگاں	ضائع
کانشنس	ضمیر۔ زندگی کی آواز
مربّی	سرپرست، مہربان، تربیت دینے والا
مزاحمت	رکاوٹ
وحیدِ عصر	یکتائے زمانہ، جس کا اپنے زمانے میں کوئی جوڑ نہ ہو، لاثانی

فاقہ میں روزہ

ابتر	خراب
اہلیہ	بیوی
بلی	کڑا یا شہتیر جس سے چھت کو سہارا دیا جاتا ہے۔
بھادوں	بکرمی سال کا پانچواں مہینا جو ۱۵ اگست سے ۱۵ ستمبر تک ہوتا ہے۔
تاج ور	تاج والے، بادشاہ
تاراج	تباہ
تیغ و تفنگ	تلوار اور تیر
تیموری:	مُراد مُغل حکمران
غازی آباد	ریاست اتر پردیش کا ایک شہر جو دلّی کے قریب واقع ہے
غدر	۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی، جسے انگریز غدر یا بغاوت کا نام دیتے ہیں
قتلے	ٹکڑے
قطب صاحب	دلّی سے تین کلومیٹر دور حضرت قطب الدین بختیار کاکی کا مزار واقع ہے۔
کلُّ جدید لذیذ	تمام نئی چیزیں دلکش ہوتی ہیں
کھیل	اناج کا معمولی سا دانہ
لق و دق	ویران
گردشِ فلاکت	بد قسمتی

جولان گاہ	میدانِ عمل، میدانِ جنگ	ماما گیری	ملازمت
چوپاڑ	چوپال، بیٹھک، جہاں مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا ہے	مصاحب	دوست، صحبت میں رہنے والا
حفاظ	حافظ کی جمع	مکدّر	خراب، بدمزا
رتھ	گھوڑا گاڑی	مکلّف	پُرتکلّف
زیروزبر	تہ وبالا، تباہ برباد	میوات	ریاست الور کے قریب ایک علاقہ جہاں میو لوگ آباد ہیں
صلاح	مشورہ	ندیم	دوست
ظلِ سبحانی	اللہ کا سایہ، مُراد بادشاہ (بہادر شاہ ظفر)		

پھر وطنیت کی طرف

آفرینش	پیدائش	رجعت	واپسی
اعلائے کلمۃ اللہ	اللہ کا کلمہ بلند کرنا	رَفعت	بلندی
اقطاع	(قطع کی جمع) ٹکڑا،	ضُعف	کمزوری
الہام	وہ بات جو اللہ کی طرف سے دِل میں آئے	فروغ	ترقی
انحراف	منحرف ہونا، دُور ہٹنا	قطعیت	پورے یقین سے
بحرِ بے پایاں	سمندر جس کی تہہ بہت گہرائی میں ہو	متصرف	استعمال میں لانا،

بہرہ مند ہونا	فائدہ اُٹھانا	مَرغزار	سبزہ زار۔ چمن
بے کراں	بغیر کناروں والا۔ وسیع، لمبا چوڑا	مُعمّا	پہیلی
تاسیس	افتتاح۔ ابتدا	نصب العین	بنیادی مقصد
ترک تاز	دوڑ دھوپ	نعمتِ عُظمیٰ	عظیم نعمت
خاکم بہ دہن	میرے منہ میں خاک (کوئی بُرا کلمہ منہ سے نکالتے ہوئے کہتے ہیں)	یارا	جُرات، ہمت

شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار

ابنِ عرب شاہ	دمشق کا ایک ادیب جس نے اپنی ایک کتاب میں امیر تیمور پر شدید تنقید کی تھی۔	صاحبِ مراتب	مرتبے والے، عزت والے لوگ
انبوہِ کثیر	بہت زیادہ لوگ	صفا آور دید	خوش آمدید
اصطرلاب (astrolabe)	ایک آلہ جس سے ستاروں کا مقام اور فاصلہ معلوم کیا جاتا تھا۔	طوسی	(نظام الملک طوسی) سلجوقی سلطان الپ ارسلان کا وزیر، نہایت زیرک اور دانا تھا۔
اقلیدس	یونان کا ایک عالم جس نے جیومیٹری کے علم میں اہم پیش رفت کی تھی۔	طوسی	طوس (ایران کا ایک شہر) سے منسوب
ایستادہ	کھڑا	ظفریابی	کامیابی

برگزیدہ	بزرگ، مقبول، پسندیدہ
بقائے دوام	ہمیشہ کی زندگی، ہمیشہ باقی رہنے والے
بقعہ نور	بہت زیادہ روشن مقام، وہ گھر جہاں بہت زیادہ روشنی ہو۔
بوعلی سینا	مشہور مسلمان طبیب
بے تامل	فوراً، بغیر کوئی بحث کیے
پنا	زمرّد (ایک قیمتی پتھر)
پنڈت	ہندوؤں کا عالم
پیل پیکر	ہاتھی جیسی جسامت والا، زور آور
تختِ طلسمات	جادو کا تخت
تماشہ جمال	خوب صورتی کا تماشہ
تمکنت	اختیار، حکومت، شان، غرور
جبہ	لمبا کوٹ، چوغا

عالی وقار	بہت زیادہ عزت اور وقار والے
عمامہ	چوغا
غول	گروہ، مجمع، جمگھٹا
فردوسی	ایران کا مشہور شاعر جس کا قصیدہ "شاہنامہ" تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔
فرش فروش	قالین اور دیگر آرائش کا سامان
فصاحت و بلاغت	کلام اور گفتگو کا فن، وہ نکات جن سے کلام خوبصورت اور دلکش ہو
قطب نما	آلہ جس سے سمتوں کا تعین کیا جاتا ہے
قلۂ کوہ	پہاڑ کی چوٹی
قیل وقال	بحث، گرماگرمی
کالی داس	سنسکرت کا عظیم شاعر اور ڈرامہ نگار جو راجا چندر گپت کے زمانے میں تھا
کلّہ شیر	شیر کا جبڑا

NOT FOR SALE

جرثقیل	بھاری بوجھ اُٹھانے والا آلہ (Lever)
چغتائی	مراد مغل خاندان
چیدہ چیدہ	خاص خاص
جریب	لکڑی جس پر چاندی کا خول چڑھا ہوتا ہے
جھاڑ	ایسا فانوس جس پر ایک سے زیادہ شمعیں روشن ہو
حسب مدارج	حیثیت کے مطابق، رتبے کے مطابق
حورشمائل	حور کی طرح
خلعت	وہ لباس جو بادشاہ کسی کو انعام کے طور پر بیش قیمت عطا کرے۔
خود	سر کی حفاظت کرنے والی ڈھال، ہیلمٹ
دارا	ایران کا بادشاہ جس نے سکندر سے شکست کھائی تھی

کمپاس	پرکار، قطب نما (Compass)
کیانی	ایرانی بادشاہان کے لقب "کے" سے منسوب
گرز	ایک ہتھیار جو اُوپر سے گول ہوتا ہے اور اس میں ایک دستہ لگا ہوتا ہے جسے دورانِ جنگ دشمن کے سر پر مارتے ہیں
گوش	کان
متاسف	افسوس کرنے والا
متشرع	شریعت کی پابندی کرنے والا
محاسب	احتساب کرنے والا
محقق	تحقیق کرنے والا
مذاق	ذوق

NOT FOR SALE

درفش کاویانی	ایرانی سلطنت کا جھنڈا جو چمڑے سے بنا ہوا تھا۔
دیرینہ سال	بوڑھا
راجا بھوج	ایک ہندو راجا جو بہت اچھا شاعر ادیب اور فلاسفر تھا
رفعت	بلندی
سانگ	سوانگ، بہروپ
سحاب	بادل
سکندر	یونان کا مشہور بادشاہ اور مشہور فلسفی ارسطو کا شاگرد
سنگھاسن بتیسی	کتاب کا نام۔ بتیس پریوں سے گھرا ہوا تخت
سیتان	مشرقی ایران کا شہر، زرتشتی مذہب کا مرکز
شائق	شوقین
منقسم	تقسیم
مہاجن	سوداگر، سیٹھ، کاروباری آدمی
مہاراجہ بکرماجیت	ہندوستان کا بادشاہ، عادل اور انصاف پرور، اس کے دور میں علم و فن اور تہذیب وتمدن کو فروغ ملا۔ بکرمی کیلنڈر کا آغاز کیا۔
ہاتف	غیب کی آواز دینے والا، فرشتہ
مرتّب	ترتیب دینا
مقافی	وہ علم جس سے الفاظ کا صحیح اور موقع کی مناسبت سے استعمال کیا جائے۔
مقصود بالذات	اصل مقصد

چندروز روڈ رولر کے ساتھ

اسپ تازی	تیز رفتار گھوڑا
بھاشا	زبان، بولی
بُنت	بُنائی
پرت	تہہ
چھتنار	گھنا، چھتری کی شکل
دینوسار	قدیم زمانے کا ایک دیو ہیکل جانور جو اَب ناپید ہے
سواگت	استقبال
اعجوبۂ روزگار	عجیب وغریب
معکوس	اُلٹا، واپس
قوی الجثہ	مضبوط جسم
مہین	باریک
ہست	زندگی، کائنات، عالمِ وجود
ہودہ	ہاتھی کی پیٹھ پر رکھا جانے والا ڈولا

منظور

گانٹھ	جڑ، گرہ (یہاں ہلدی کی جڑ مراد ہے)
ناک کا بانسا	دونوں نتھنوں کے بیچ کی ہڈی (ناک کی ہڈی)
رَعشہ	کپکپی، لرزہ (ایک بیماری جس میں بدن کانپتا ہے)
اکڑے ہوئے	پٹھوں کا تناؤ، پٹوں کا مروڑ
کوستا رہا	مارتا رہا، پیٹتا رہا
نقاہت	کمزوری، ناتوانی
صعوبت	مصیبت، سختی، تکلیف
مفارقت	جدائی، علیحدگی
ٹیسیں اٹھنا	درد کرنا، کسک ہونا (وہ درد جو زخم میں ہوتا ہے)
چہرہ تمتمانا	چہرہ چمکنا/دمکنا، چہرہ جگمگاتا
افاقہ	مرض میں کمی، صحت، شفا
معجزہ	کرامت، کرشمہ، وہ کام جو انسانی طاقت سے باہر ہو، ناممکن جسے کوئی پیغمبرِ خدا ممکن بنائے (miracle)

لوتھڑا	جمے ہوئے خون کا ٹکڑا، بغیر ہڈی کے گوشت کا ٹکڑا
معین	ٹھہرایا گیا، مقررہ
نیم مندی آنکھیں	آدھی بند آنکھیں
نحیف دل	کمزور دل، ضعیف دل
چہکنے چہکارنے	پرندوں کی آواز، یہاں مراد خوشی میں آکر بولنا
اعصاب	پٹھے، رگیں (muscles)
تناؤ	کھنچاؤ (stress)
گھٹی گھٹی زندگی	تکلیف زدہ زندگی، بے کسی کی حالت
قنوطیت	مایوسی، زندگی کا تاریک پہلو دیکھنا
رجائیت	اچھے خیال رکھنا، زندگی کا روشن پہلو دیکھنا، آرزو سے پُر ہونا
چمکارتا پچکارتا	پیار کرنا، دلاسا دینا
رُندھ گئی	رُک گئی، قید ہو گئی، اٹک گئی

کتبہ

پھلواری	پھولوں کا چھوٹا باغ
گہما گہمی	رونق/لوگوں کی کثرت
خس و خاشاک	گھاس پھونس
خلافِ معمول	عادت کے خلاف
خاکی زین	فوجی وردی کا موٹا کپڑا
سولا ہیٹ	دھوپ سے بچاؤ کی ٹوپی
چھاتا	چھتری
بیڑی	ڈھاک کے پتے میں لپٹے ہوئے تمباکو کا سگریٹ
گرہستی	گھریلو
منچلے	بے خوف/بے فکرے
بد قطع	بدصورت
رنگروٹ	نیا بھرتی ہونے والا سپاہی
خراماں خراماں	ٹہلتے ٹہلتے
مَسیں بھیگنا	مونچھوں کا رُواں نکلنا
گھاگ	تجربہ کار/ہوشیار
گُدّی	گردن کا پچھلا حصہ
کُند اُسترہ	بال مونڈھنے کا آلہ جو تیز نہ ہو

گتھی	مشکل/الجھن
غل غپاڑہ	شور شرابا
سُوجھنا	نظر آنا، دکھائی دینا
کہنہ فروش	پُرانی چیزیں فروخت کرنے والا
قماش	طرح/قسم
چوکھٹا	فریم
لم ڈھینگ	لمبی ٹانگوں والا آبی پرندہ
ساجھا	شراکت داری
سعیٔ لاحاصل	فضول کوشش
جلی حروف	موٹے حروف
کواڑ	دروازے میں لگا لکڑی کا تختہ
جان کھپانا	مشقت کرنا
سبز باغ دِکھانا	فریب دینا
جویا	تلاش کرنے والا
ہیجان	ہل چل

مائیں

بہشتی	گھروں میں پانی لانے والا
کے ہزار	کتنے ہزار
نالاں	شاکی/تنگ
اکنی	ایک آنہ
سائیں	درویش/فقیر
مول تول	قیمت کا تعین کرنا
سنیاسی	تارک الدنیا
کاٹھ	لکڑی
لطیفہ غیبی	غیب کی مہربانی جو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو
مژدہ	خوش خبری
آلکس	سُستی
دہک اٹھنا	روشن ہونا
فارغ البالی	بے فکری/آزادی
مندا	نقصان
پٹی	چارپائی
افاقہ	مرض میں کمی ہونا
لونڈے	لڑکے

بے نقط سنانا	بُرا بھلا کہنا، گالیاں دینا
تو تکار	لڑائی جھگڑا۔
متصل	وصل شدہ، ملے ہوئے
مشک	(کھال) چمڑے کا بنا ہوا تھیلا جس میں پانی لایا جاتا ہے

سیاہ فام

آوارہ	گلی کوچوں میں یونہی گھومتے پھرنے والا
آناً فاناً	جھٹ پٹ۔ یکا یک
ہکا بکا	حیران۔ حواس باختہ
کراہنا	تکلیف میں آہ آہ کی آواز نکالنا
سہما ہوا	خوف زدہ
وحشت زدہ	ڈرا ہوا، خوف زدہ
مڈ بھیڑ	آمنا سامنا
بے سُدھ	بے ہوش
کاری	گہرا ارجہلک (وار)
کالا کلوٹا	نہایت کالا
کُبڑا	کوز پشت۔ وہ شخص جس کی پیٹھ جھک گئی ہو
کترانا	پہلو تہی کرنا، بچ کر نکلنا
سناٹا	خاموشی
ٹھٹک کر رہ جانا	حیران ہونا۔ رکنا
گھگھی بندھ جانا	مارے خوف کے بول نہ سکنا
باچھیں کھلنا	خوش ہو جانا
وضع	شکل، حلیہ
امتدادِ زمانہ	لمبا عرصہ گزر جانا
ارہر	ایک قسم کا بیج جسے دال کے طور پر پکایا جاتا ہے۔
برافروختہ	غصہ
لاٹ	چبوترہ، اُونچی جگہ
غنیم	دشمن
بھوت	خبیث روح، آسیب
کوسنے	لعنت، دعائے بد
ٹھگنا	لوٹنا، دھوکے سے کسی کا مال لینا
قضیہ	جھگڑا، بحث
اینٹھنا	دھوکہ دہی سے کسی سے کوئی چیز لے لینا
مشاطہ	وہ عورت جو عورتوں کی بناؤ سنگھار کرتی ہے
دبک جانا	چُھپنا، ڈر جانا
منجھنا	ماہر ہونا۔ تجربہ کار بن جانا
ہُو کا عالم	ویران۔ سنسان
بڈھال	مضمحل۔ تھکا ہوا
بدررو	گندے پانی کے نکاس کا نالہ

محسن محلہ

آب خورہ	پانی کا برتن	دہاڑی	ایسی مزدوری جس کا معاوضہ روزانہ ملتا ہے۔
کنگنی	چکنا اناج	مبالغہ	جھوٹ، دروغ
مرنجاں مرنج		یکمشت	اکٹھے

NOT FOR SALE

کنڈکٹر

آبدیدہ	آنکھوں میں آنسو آنا
ارتھی	ہندوؤں کا جنازہ
اَسرار	سِر کی جمع (راز)
الکسی	سستی
بَیری	دشمن
پھٹکار	لعنت، بے رونقی
پٹھورے	جانوروں یا پرندوں کا جوان تر بچہ
تُلسی	ایک پودے کا نام جسے ہندو متبرک سمجھتے ہیں۔
ڈومن	(مذکر ڈوم) ایک چڑیا کا نام
رن	میدانِ جنگ
کنگ ریڈر	انگریزی کی کتاب جسے سکولوں میں پڑھایا جاتا تھا
گجر	چار، آٹھ اور بارہ بجے گھنٹیوں کا بجنا، صبح سویرے
لحن	آواز
لم ڈوریں	پتنگ لڑانا
معقول	مناسب
مواج	موج کی جمع
وحشت	گھبراہٹ، دیوانگی
ہونق	احمق
ہیبت	ڈر، خوف

ایک وصیت کی تعمیل

آگے ناتھ نہ پیچھے پگا	جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو
اڑواڑ	ٹیک جو دیوار کو گرنے سے بچاتی ہے
اطلس	ریشم
برقی رو	بجلی کی لہر
پھبتی	مذاق اُڑانا
بے نقط سنانا	گالیاں دینا
تیرِ قضا	موت
شاکی	شکایت کرنے والے
طبع رسا	بات کو جلد سمجھنے والا، عقلمند
عنابی	تیز سرخ رنگ
غل غپاڑا	شور شرابا
غیر مطبوعہ کلام	وہ کلام جو چھپا نہ ہو
کرنجی	نیلی
کم یاب	کم کم ملنے والا

NOT FOR SALE

چاندنی	دری
خشک سالی	قحط، مصیبت
چوبا چکٹ	ملیے
خُدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے	اللہ تعالیٰ ہر جاندار کو اُس کا رزق پہنچاتا ہے۔
دارالترجمہ	وہ دفتر جہاں ترجمے کا کام کیا جائے
دل تنگ ہونا	کنجوس ہونا
ڈھنڈار	ویران
رکاکت	ناتراشیدہ
زخم ہرے ہونا	دُکھ تازہ ہونا
زُود فہمی	بات کو جلد سمجھنے والا، ہوشیار
کھتّی	اناج رکھنے کا گڑھا
گڈی	بنڈل
مٹھی بند ہونا	کنجوسی
منڈوا	جلسہ گاہ
نایاب	نہ ملنے والا
نگاہ وسیع ہونا	تجربہ حاصل ہونا
نگینہ	قیمتی پتھر
یورش	حملہ

علامہ اقبالؒ

استعجاب	تعجب، حیرت
اشتیاق	شوق
اہنسا	عدم تشدد (گاندی جی کا مشہور فلسفہ)
حاجب	دربان، چوکیدار
خشکہ	ابلے ہوئے چاول
دھان پان	کمزور
سامعین	(سامع کی جمع) سننے والے
ستیا گرہ	حکومت کے خلاف گاندھی کی پُرامن تحریک (لفظی معنی سچائی / اخلاص)
شاگرد پیشہ	عملہ، ملازم، ملازموں کے رہنے کی جگہ
قبح	بُرا، خراب
قرقی	ضبط ہونا
گداز	نرم
مشتِ استخوان	ایک مٹھی ہڈیاں؛ مُراد بہت کمزور
مہتر	چترال کے حکمران مہتر کہلاتے تھے
شب دیگ	شلجم اور گوشت کا سالن جو تمام رات دھیمی آنچ پر پکتا ہے
سمع خراشی	کان کھانا، بے کار باتیں

NOT FOR SALE

طائرِ لاہوتی

باغ و بہار	خوش مزاج
بذلہ سنج	خوش مزاج
بیٹھک	ڈرائینگ روم، مہمان خانہ
پیچ و تاب	غصہ
پیش خیمہ	سبب، آغاز
ترویج	رواج دینا، رائج کرنا
تصوف	صوفیہ کا طریقہ/عقیدہ
تُند مزاج	غصیلہ
تنقید	پرکھنا، اچھائی یا بُرائی جاننا
جمالیات	حُسن شناسی، خوب صورتی
چشمک	اختلاف
خیام	(عمر خیام) ایران کا مشہور رباعی گو شاعر
زمہریر	کرّۂ ہوائی کا ایک حصہ جو بے حد ٹھنڈا ہے۔
سجادہ نشین	پیر یا مرشد کی گدی پر بیٹھنے والا، قائم مقام
سالار	سردار
سبھا	محفل
شاق	دُکھ
طفل	بچہ
طلسمی	جادوئی
غنیمت	لُوٹ کا مال، قابلِ قدر
کرتا دھرتا	منتظم
لغزش	غلطی
مبتدی	ابتدا کرنے والا
مجذوب	اللہ کی محبت میں ڈوبا ہوا
محاذ آرائی	اختلاف، جھگڑا
مراقبہ	غور، سوچ بچار، سب کچھ چھوڑ کر اللہ سے لَو لگانا
مقالہ	ایسا مضمون جو تحقیق اور اعداد و شمار کی روشنی میں لکھا گیا ہو۔
مکتب	مدرسہ
وسیع المشرب	جس میں مذہبی تنگ نظری نہ ہو
وضع دار	سنجیدہ، اچھی وضع قطع رکھنے والا

NOT FOR SALE

مرید پور کا پیر

اِدبار	بدنصیبی
بہ بانگِ دہل	بلند آواز سے۔ علانیہ
بدعنوان	کرپٹ (corrupt)
براہین قاطع	قطعی دلائل
بدودمان	قبیلہ، خاندان
چاردانگ عالم	دُنیا کے چاروں طرف
فلاکت	غریبی، بدقسمتی، نحوست
ماحضر	جو کچھ حاضر ہے، جو تیار ہے
منحنی	باریک، کمزور
نخوت	غرور، گھمنڈ، تکبّر
نصائح	نصیحت کی جمع
نئی پود	نئی نسل
ورے	پاس، نزدیک، اُس طرف

خارِ وطن از سنبل وریحان خوشتر: وطن کے کانٹے سنبل اور ریحان کے پھولوں سے بہتر ہیں

عنداللہ ماجور	اللہ کے نزدیک ثواب دیا گیا
عندلیب	بلبل

حاجی اورنگ زیب خان

آفتابہ	لوٹا
اتمام حجت	آخری دلیل، شریا بحث ختم کرنے کی آخری کوشش
استغراق	غرق ہونا، ڈوب جانا
اشتہا	بھوک
خورسند	خوش، شادمان
دشنام	گالی
ڈھاٹا	وہ کپڑا جو منہ پر باندھا جاتا ہے
سیروسس	جگر کی بیماری جس میں جگر سکڑ جاتا ہے اور کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

بارٹر	(اقتصادیات کی اصطلاح) مال کے بدلے مال
بامتثالِ امر	حکم ماننا
بوجھوں مارنا	بہت زیادہ بوجھ اُٹھانے والا
پنڈ چھڑانا	جان چھڑانا
تُرنت	فوراً، جلدی
تنازع	جھگڑا، مسئلہ
جوتم پیزار	ماردھاڑ
جھمیلا	مصیبت
سیزن کرنا	لکڑی کو سکھانے اور اُس کی نمی ختم کرنے کے عمل کو کہتے ہیں
صیب	صاحب
عجلت	جلدی
کھٹل	کُند
کٹھل	گانٹھ والا، سخت، جما ہُوا
معروضہ	عرضی، گزارش
منتہی	تعلیم مکمل کرنے والا
نوسرباز	دھوکے باز

جوابِ شکوہ

آبا	آباواجداد
آئین	قانون، طریقہ
اَسرار	سِر (راز) کی جمع
الحاد	مذہب سے بیزاری، لادینی
فاطرِ ہستی	ہستی (دُنیا) کا پیدا کرنے والا، اللہ تعالیٰ
فردا	آنے والا کل
فقر	درویشی اور قناعت
قدسی الاصل	اصل کے لحاظ سے مقدس اور پاک
قصور	قصر (محل) کی جمع
پیرِ گردوں	زُحل سیارہ جسے پیرِ فلک بھی کہا جاتا ہے۔
تاتار	تاتاری، منگول قوم جو بعد میں مسلمان ہوگئی۔
تارک	ترک کرنے والا
خُم	صراحی
دہر	دُنیا
رخت	سامان
رضواں	جنّت کا داروغہ
سُکّانِ زمیں	زمیں پر رہنے والے، سکونت رکھنے والے

کم	کمیت (quantity)
کَئی	(کَے) ایرانی بادشاہان کا لقب
کیف	وہ شے جو تقسیم کو قبول نہ کرے جیسے سیاہی سفیدی
گردوں	آسمان
تگ ودتاز	بھاگ دوڑ
جذبِ باہم	باہمی جذبہ یا محبت
جور	ظلم وستم
حجازی	حجاز (عرب) سے متعلق یعنی مسلمان
حکایت	کہانی، واقعہ
حمیّت	غیرت
حیدری	حضرت علیؓ سے متعلق
گِل	مٹی
لوح وقلم	تختی اور قلم، مراد تقدیر
مخفی	خفیہ، چھپا ہوا
مسجود	جس کو سجدہ کیا جائے۔
ملائک	ملک (فرشتہ) کی جمع
وضع	حلیہ، طریقہ
ہنود	ہندو کی جمع
سلف	(جمع: اسلاف) آباواجداد
شِعار	طریقہ
شعور	سمجھ، عقل

بڑھے چلو

ریگزار	ریگستان
دلاور	بہادر
افتخار	فخر
تیغ زن	تلوار چلانا
قسمت سعید	خوش قسمتی
رزم گہ	میدانِ جنگ

مناظرِ سَحر

روح فزا	تازگی بخشنے والا
گردوں	آسمان
نسیمِ سحری	صبح کی ہوا
خنکی	سردی/ٹھنڈک
مُصفّا	پاک/صاف ستھرا
برگ	پتّا
ناقوس	وہ سنکھ جو ہندو پوجا کے وقت بجاتے ہیں۔
فغاں	فریاد/شور

شکست کی آواز

اُمنگ	خواہش، ارمان
ماہ پارہ	چاند کا ٹکڑا
ضعیفی	کمزوری، ناطاقتی
مشیّت	مرضی

ستارے

جوئے	نہر
نغمہ	گیت
خُلد	جنّت
انجم	ستارا
وسعت	پھیلاؤ/کشادگی
دِیار	شہر
مدہوش	بدمست
ہستی	زندگی
نوحہ	رونا/گریہ
ترنّم	گانا، گنگنانا
مدبھرے	مست/نشیلے
نورپارہ	روشنی کا ٹکڑا
خاک داں	(مجازاً) دُنیا
گہوارہ	بچوں کو سُلانے کا جھولا
لطافت	نرمی/نزاکت

نفیرِ عمل

نفیرِ عمل	عمل کی پکار
شومیِ تقدیر	بدبختی/خراب نصیب
ماتم	رنج کرنا/گریہ زاری
شیون	غم/سوگ
جور	ظلم
فلک	آسمان
پیر	بوڑھا
شکوہ	شکایت
بے مہری	بے رحمی
چمنستان	پھولوں کا قطعہ
تجلّی	روشنی
شبستان	آرام گاہ
نالہ	فریاد
دبستان	مکتب/مدرسہ
چارہ	درد کا علاج
پیروی	اطاعت
مسلک	طریقہ/قاعدہ
گراں مایہ	قیمتی
جامِ جم	وہ پیالہ جو بادشاہ جمشید کی خواہش پر تیار کیا گیا تھا اور جس میں نجوم کے ذریعے مستقبل کا حال معلوم کیا جاتا
شوکت	شان
کَے	بادشاہ/حاکم (ایران کا مشہور حکمران خاندان)
حشمت	شان و شوکت
صولت	رعب/دبدبہ
رَے	ایران کا مشہور حکمران خاندان جو انتہائی شان و شوکت رکھتا تھا
خدشہ	فکر
آلام	اَلَم کی جمع۔ رنج و غم
مکر و ریا	دھوکا اور دکھاوا
کاسہِ حرص	لالچ کا کٹورا
طرفہ	عجیب

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں

ڈھارس بندھانا	تسلّی دینا، حوصلہ بڑھانا
دیرینہ	پرانا، قدیم
فقط	صرف، محض

بڑے ڈرپوک ہو تارو!

اوڑھنی	چادر
برچھی	چھوٹا نیزہ
بے انت	جس کا کوئی انجام نہ ہو
تیرگی	تاریکی، اندھیرا
سورما	بہادر
قوس	نصف دائرہ
کہرام	شور، ہنگامہ
گُرز	ایک گول وزنی ہتھیار
منوّر	روشن
میخ	کیل

اقبالؔ

آبگینہ	شیشہ
ارادت	عقیدت
خرقہ پوش	درویشانہ۔ فقیری لباس
سفینہ	کشتی
شمعِ کُشتہ	بُجھی ہوئی شمع
ظلمت خانہ	اندھیرا گھر
قرینہ	طریقہ
محمل	کجاوہ۔ اونٹ کے اُوپر پالکی
مکین	رہنے والا
مے	شراب
ناخدا	ملاح
نفس	سانس
نکتہ چیں	تنقید کرنے والا
یدِ بیضا	روشن اور چمک دار ہاتھ

فیض احمد فیض

بات	ہاتھ	مقتل	قتل گاہ، پھانسی گھاٹ
دھج	انداز، طریقہ		

احمد ندیم قاسمی

دَر	دروازہ، دہلیز	گھر جانا	محصور ہونا
پہلو	قرب، پاس	پیمانِ وفا	ساتھ دینے کا وعدہ/اقرار
چارہ ساز	علاج کرنے والا، کام بنانے والا	معیار	پرکھ، کسوٹی
سنور جانا	آراستہ ہونا، درست ہونا		

ناصر کاظمی

احباب	(حبیب کی جمع) دوست	عارض	گال
اولیں	پہلا	لب	ہونٹ
سرشاری	خوشی، مسرت		

شکیب جلالی

در و بام	(دروازہ اور چھت) مُراد مکان	دستار	پگڑی (جو بزرگی اور عزت کی علامت ہے)

احمد فراز

اَسرار	(سِر کی جمع) راز	لب کُشا	لب کھولنا، بولنا
دار	پھانسی کا مقام	پسِ پردہ	پردے کے پیچھے

ظفر اقبال

شراکت	حصہ داری، شریک ہونا	دشت	صحرا، بیابان
دانستہ	جان بوجھ کر، قصداً	وحشت	ڈر، خوف، پاگل پن
عنایت	مہربانی، توجہ	رعایت	طرف داری کرنا، مہربانی کرنا
کُشادہ	کھلا، وسیع	حسرت	آرزو، ارمان

شہزاد احمد

اصرار	ضد، تاکید	عظمت	بڑائی، بزرگی
گردن زدنی	واجب القتل، مار ڈالنے کے قابل	زخم سینا	لفظی معنی زخم کو ٹانکے لگانا، مراد: دادرسی کرنا، حوصلہ بڑھانا

مومن تو آپس میں بھائی ہیں۔
تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو۔
اور اللہ سے ڈرتے رہو۔
تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

(سورۃ الحجرات :۱۰)

ایک دوسرے کا مال آپس میں
ناحق نہ کھاؤ۔

(سورۃ البقرہ آیت ۱۸۸)

مؤلف کا تعارف

پروفیسر محمد جمال:

۱۹۸۹ء میں پشاور یونیورسٹی سے ایم اے اُردو میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۹۰ء سے ایڈورڈز کالج پشاور میں درس و تدریس سے منسلک ہیں۔ متعدد سیمیناروں اور ورکشاپوں میں حصہ لے چکے ہیں۔ ۲۰۰۰ء سے صدرِ شعبہء اُردو (ایڈورڈز کالج) کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور کی متعدد کتابوں کے مؤلف بھی ہیں۔